بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

Islamic & Intellectual Studies Magazine

(IISM)

اسلامک اور علم و دانش ریسرچ میگزین

شمارہ: دسمبر 2021، ربیع الثانی / جمادی الاول 1443

إِنَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللَّهَ مُخْلِصًا لَهُ الدِّينَ

کہو، آؤ میں سناؤں وہ چیزیں جو تمہارے رب نے تم پر حرام کی ہیں، یہ کہ تم اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کرو اور اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو۔ ہم تم کو بھی روزی دیتے ہیں اور ان کو بھی۔ اور بے حیائی کے کام کے پاس نہ جاؤ خواہ وہ ظاہر ہو یا پوشیدہ اور جس جان کو اللہ نے حرام ٹھہرایا اس کو نہ مارو مگر حق پر۔ یہ باتیں ہیں جن کی اللہ نے تمہیں ہدایت فرمائی ہے تاکہ تم عقل سے کام لو۔ اور یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ مگر ایسے طریقے سے جو بہتر ہو یہاں تک کہ وہ اپنی جوانی کو پہنچ جائے۔ اور ناپ تول میں پورا انصاف کرو۔ ہم کسی کے ذمہ وہی چیز لازم کرتے ہیں جس کی اسے طاقت ہو۔ اور جب بولو تو انصاف کی بات بولو خواہ معاملہ اپنے رشتہ دار ہی کا ہو۔ اور اللہ کے عہد کو پورا کرو۔ یہ چیزیں ہیں جن کا اللہ نے تمہیں حکم دیا ہے تاکہ تم نصیحت پکڑو۔ (اور فرمایا ہے) کہ یہی میرا راستہ سیدھا راستہ ہے، سو اسی کی پیروی کرو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ تمہارے پروردگار کی راہ سے تمہیں الگ کر دیں۔ یہ باتیں ہیں جن کی اس نے تمہیں ہدایت کی ہے تاکہ (اُس کی گرفت سے) بچے رہو۔ (سورۃ الانعام، آیات 151-153)

www.mubashirnazir.org

Islamic & Intellectual Studies Magazine

(IISM)

اسلامک اور علم و دانش ریسرچ میگزین

آج جدید دور نے دین و دنیا سے متعلق مختلف سوالات پیدا کر دیے ہیں۔ کہیں الحاد کا دور دورہ ہے تو کہیں خود ساختہ ادیان رائج ہیں۔ اِن حالات میں دین کی بلا تعصب، غیر جانبدارانہ اور قرآن و سنت کی روشنی میں درست ترجمانی ناگزیر ہے۔ اسی مقصد کے لیے اسلامک اور علم و دانش ریسرچ میگزین (Islamic and Intellectual studies Magazine) کا اجراء کیا گیا ہے، تاکہ دورِ جدید میں مختلف موضوعات سے متعلق دین کا صحیح نقطۂ نظر بلا کم و کاست قارئین تک پہنچایا جا سکے۔ اِس میگزین میں ایمان و اخلاق کی دعوت، تعمیر سیرت، اللہ اور آخرت کی معرفت، تاریخ، سوشل سائنسز اور دورِ حاضر کے تمام گمراہ کن نظریات کو پہچان کر ان سے بچنے کے حوالے سے موضوعات زیرِ بحث آئیں گے۔ اللہ تعالیٰ اس سارے معاملے میں ہمارا حامی و ناصر ہو۔ آمین

نوٹ: مدیر کا مراسلہ نگار سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

آفیشل ویب سائٹ: www.mubashirnazir.org

رابطہ کرنے، تحریریں، آراء اور سوالات بھیجنے کے لئے

Mubashir.nazir@gmail.com , refatnawab@gmail.com

فہرست مضامین

ڈاکٹر محمد شکیل عاصم

اختلاف کے آداب

یہ بات واضح ہے کہ ہمیں قرآن اور سنت سے محبت ہے۔ اور یہ بات بھی ہم سے مخفی نہیں ہے کہ ہماری کسی بھی بحث کا سبب قرآن و سنت سے لگن ہی ہے۔ اور ہم یہ بھی نظریہ رکھتے ہیں کہ اختلاف کی صورت میں قرآن و سنت سے قریب تر بات اپنانی چاہیے اور اس کی بنیاد بھی رضاء الٰہی کا حصول ہو۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اخلاص عطا فرمائے۔ اگر آپ مذکورہ بالا باتوں سے اتفاق کرتے ہیں، اور یقینا کرتے ہوں گے، تو آگے پڑھیے۔

کیا آپ اس بات کا یقین رکھتے ہیں کہ اختلاف رائے کا وجود فطری امر ہے اور اختلاف عموماً جہاں نصوص (قرآن و حدیث کی عبارت) کے فہم میں فرق ہونے کی وجہ سے ممکن ہے تو وہاں اس کا سبب علم میں کمی و بیشی بھی ہو سکتا ہے؟ جبکہ بعض اوقات چیزوں کو پرکھنے کا معیار (Criteria) اور اصول و ضوابط میں فرق بھی اختلاف کا باعث ہوتا ہے۔ ان سب کے علاوہ اختلاف کی ایک اور وجہ ،جو عموماً ہمارے معاشرے میں پائی جاتی ہے، ضد، تعصب اور "انا" ہے۔ (اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے محفوظ فرمائے)۔ ہم اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے کہ دوسرے شخص کے ضد اور تعصب میں آنے کی وجہ بھی بعض اوقات ہمارا اپنا رویہ ہوتا ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں کسی معاملے میں اختلاف رائے کوئی اجنبی معاملہ نہ تھا، کئی ایک موقعوں پر وہ دوسرے سے اختلاف رائے رکھتے اور اس کا سبب فہمِ نصوص میں اختلاف کے ساتھ بسا اوقات علمِ نصوص میں کمی بیشی بھی تھا۔ مگر جب غلط فہمی سے درست فہمی کی طرف سفر کیا یا عدم علم سے علم کے زینے پر چڑھے تو اپنی رائے کو بے دھڑک بدل ڈالا۔ کیا ہم اتنی جرات رکھتے ہیں کہ اپنی بات کا ضعف واضح ہونے کے بعد کھلے عام اعتراف کر لیں؟ اگر جواب "ہاں" میں ہے تو آگے بڑھیے ابھی تک ہم متفق ہیں۔

کیا آپ جانتے ہیں کہ اگر کوئی شخص کسی مسئلہ میں آپ سے مختلف رائے رکھتا ہے اور وہ متبع سنت ہونے کے علاوہ دین کے ساتھ مخلص بھی ہے تو اس کا آپ سے مختلف الرائے ہونا، اس سے نفرت کا سبب قرار نہیں پا سکتا، اگرچہ آپ کو ہزار بار ہی یقین ہو کہ آپ درست رائے پر ہیں۔ قابل نفرت ہونا تو درکنار، اللہ تعالیٰ تو مخلص مجتہد کو اجر سے نوازتا ہے۔ اب یقیناً آپ یہ سوچ رہے ہوں گے کہ اسے بتانا تو آپ کا فریضہ ہے۔ آپ یہ سوچنے میں حق بجانب ہیں۔ اسے وہ کچھ ضرور بالضرور بتایئے جسے

آپ درست سمجھ رہے ہیں مگر اس طریقے سے (اَلَّتِي هِيَ اَحۡسَن) جو سب سے بہتر ہو۔ شریعت اسلامیہ آپ کو اپنی رائے کے اظہار کے لیے صرف ایک راستہ فراہم کرتی ہے اور وہ صرف احسن انداز اور طریقہ ہے۔ گویا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اچھے ترین طریقہ سے اپنی رائے کا اظہار کرنا ہم پر فرض ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے دوسرے سے اختلاف رکھنے کے باوجود بھی احترام کا دامن نہیں چھوڑا۔

یہ تو تصویر کا ایک رخ آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ اب ذرا دوسرے رخ کی طرف بھی التفات کیجئے۔ جس طرح آپ اپنے آپ کو درست سمجھ رہے ہیں، بعینہ مخاطب و فریق ثانی بھی اسی نفسیات میں جی رہا ہے۔ اور جس طرح آپ نے درست بات کو (جو آپ کے نزدیک درست ہے) دوسروں تک پُہنچانا اپنا فریضہ خیال کرتے ہیں اسی طرح مسلمان ہونے کے ناطے وہ بھی اس عقیدہ پر ایمان رکھتا ہے۔ اور جس طرح آپ یہ خیال کرتے ہیں کہ آپ کی بات دھیان اور توجہ سے سنی جائے، بعینہ دوسرا شخص بھی یہی چاہتا ہے کہ اس کی بات بھی دھیان اور توجہ سے سنی جائے۔ اس وجہ سے اخلاقیات اور تہذیب آپ دونوں کے لیے یہ دائرہ کھینچتی ہے کہ مخاطب کی بات کو پورے انہماک سے سنیے، ایسے کہ جیسے آپ اس کی بات کو سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ نہ کہ آپ کی باڈی لینگویج (Body language) چیخ چیخ کر بتلا رہی ہو کہ آپ تو محض بات ختم ہونے کے منتظر ہیں (ویسے ہمارے یہاں یہ بھی غنیمت ہے) اور بات ختم ہوتے ہی اپنی رائے تو تھوپنے کی کوشش کریں گے۔ انہماک اور لگن سے دوسرے کی بات سننے کی اہمیت اس وقت مزید واضح ہو جاتی ہے جب ہم انسان ہونے کے ناطے اس بات پر یقین رکھیں کہ غلطی کا امکان مجھ سے بھی ہے۔

اگر آپ کا جواب اثبات اور "ہاں" میں ہے تو آپ کا مزید ساتھ نصیب ہو رہا ہے۔ آپ کی یہ "ہاں" بہت اہم ثابت سبق دے رہی ہے کہ "ہمیں اپنی رائے کے درست ہونے کا یقین ہے اس امکان کے ساتھ کہ یہ غلط بھی ہو سکتی ہے۔ اور مخاطب کی رائے کو ہم غلط سمجھتے ہیں اس امکان کے ساتھ کہ وہ درست بھی ہو سکتی ہے۔"

گویا یہ کہا جا سکتا ہے کہ جب بھی کسی مسئلہ میں اختلاف ہو جائے تو سب سے پہلے رب تعالیٰ کے سامنے سر بسجود ہو کر حق تک رسائی کے طلب گار ہونا چاہیے، اور پھر اپنی حد تک جتنی جستجو و سعی ممکن ہو کی جائے۔

محمد مبشر نذیر

اسلام اور عصر حاضر کی تبدیلیاں (پارٹ 4)

سیاسی تبدیلی

دور جدید میں بعض اہم ترین سیاسی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ ان میں بہت سے تبدیلیاں نظریاتی اور بہت سے عملی سیاست میں میدان میں رونما ہوئی ہیں۔

جمہوریت

دور قدیم ہی سے بادشاہت اور آمریت کا نظام دنیا میں رائج رہا ہے۔ تاریخ انسانی میں اس سے استثنا صرف بنی اسرائیل کے ابتدائی دور اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم کے بعد خلافت راشدہ کو رہا ہے۔ اس کے علاوہ یونان کے عروج کے دور میں بھی جمہوریت کا تجربہ کیا گیا۔ جمہوریت اور آمریت میں بنیادی فرق یہ ہے کہ جمہوریت میں حکومت عام لوگوں کے مشورے سے قائم ہوتی ہے اور انہی سے مشورے سے ختم ہوتی ہے۔ حکومت اپنے عوام کے سامنے اپنے ہر فعل کے لئے جواب دہ ہوتی ہے۔ آمریت اس کے برعکس کسی فرد، خاندان یا گروہ کی طاقت کے بل بوتے پر قائم ہوتی ہے اور آمر اپنے افعال کے لئے قوم کو جواب دہ نہیں ہوتا۔

دور جدید میں اہل مغرب نے سیاسی میدان میں جمہوریت کی روایت قائم کر دی ہے۔ مسلم ممالک میں اس روایت کو بالعموم اختیار نہیں کیا گیا اور زیادہ تر مسلم ممالک میں بادشاہت یا فوجی آمریت کا نظام قائم ہے۔ حالیہ تبدیلیوں کے نتیجے میں دنیا میں سیاسی بیداری پیدا ہو رہی ہے اور مسلم ممالک آہستہ آہستہ جمہوری نظام کی طرف جا رہے ہیں۔ بہت سے مسلم ممالک میں لولی لنگڑی جمہوریت قائم ہو چکی ہے۔ بعض مسلم ممالک جیسے ملائشیا میں جمہوری نظام کامیابی سے چل رہا ہے۔

میڈیا کی بڑھتی ہوئی آزادی کے باعث آمرانہ قوتوں کی معاشرے پر گرفت مسلسل کمزور ہو رہی ہے۔ حکمرانوں کے احتساب کی روایت بھی آہستہ آہستہ طاقت پکڑ رہی ہے۔ اس سب کے باوجود اس معاملے میں مسلم ممالک ابھی مغربی ممالک سے سالوں پیچھے ہیں اور انہیں مغربی ممالک کے جمہوری نظام تک پہنچنے کے لئے کئی عشرے درکار ہیں۔

ہماری رائے میں دینی اور اخلاقی نقطہ نظر سے یہ ایک نہایت ہی مثبت تبدیلی ہے۔ اسلام نے معاشرے میں اجتماعیت کی جو بنیاد پیش کی ہے وہ صرف اور صرف شورائیت ہے یعنی معاشرے کا پورا نظام مشورے سے چلایا جائے۔ قرآن مجید میں اہل ایمان کی صفات کو بیان کرتے ہوئے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَالَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ۔ (الشوری:42)	اور وہ لوگ جو اپنے رب کا حکم مانتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، اپنے معاملات مشورے سے چلاتے ہیں اور ہم نے انہیں جو رزق دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

سید ابو الاعلیٰ مودودی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔

"أَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ کا قاعدہ خود اپنی نوعیت اور فطرت میں پانچ باتوں کا تقاضا کرتا ہے:

- اول یہ کہ اجتماعی معاملات جن لوگوں کے حقوق اور مفاد سے تعلق رکھتے ہوں انہیں اظہار رائے کی پوری آزادی حاصل ہو اور وہ اس بات سے پوری طرح باخبر رکھے جائیں کے ان کے معاملات فی الواقع کس طرح چلائے جا رہے ہیں اور انہیں اس امر کا بھی پورا حق حاصل ہو جو کہ اگر وہ اپنے معاملات کی سربراہی میں کوئی غلطی یا خامی یا کوتاہی دیکھیں تو اس پر ٹوک سکیں، احتجاج کر سکیں، اور اگر اصلاح ہوتی نہ دیکھیں تو سربراہ کاروں کو بدل سکیں۔ لوگوں کا منہ بند کر کے اور ان کے ہاتھ پاؤں کس کر اور ان کو بے خبر رکھ کر ان کے اجتماعی معاملات چلانا صریح بددیانتی ہے جسے کوئی شخص بھی أَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ کے اصول کی پیروی نہیں مان سکتا۔
- دوم یہ کہ اجتماعی معاملات کو چلانے کی ذمہ داری جس شخص پر بھی ڈالنی ہو اسے لوگوں کی رضامندی سے مقرر کیا جائے۔ یہ رضامندی، ان کی آزادانہ رضامندی ہو۔ جبر اور تخویف سے حاصل کی ہوئی، یا تحریص اور اطماع سے خریدی ہوئی، یا دھوکے اور فریب اور مکاریوں سے کھسوئی ہوئی رضامندی در حقیقت رضامندی نہیں ہے۔ ایک قوم کا صحیح سربراہ وہ نہیں ہوتا، جو ہر ممکن طریقہ سے کوشش کر کے اس کا سربراہ بنے، بلکہ وہ ہوتا ہے جس کو لوگ اپنی خوشی اور پسند سے اپنا سربراہ بنائیں۔
- سوم یہ کہ سربراہ کار کو مشورہ دینے کے لیے بھی وہ لوگ مقرر کیے جائیں جن کو قوم کا اعتماد حاصل ہو، اور ظاہر بات ہے کہ ایسے لوگ کبھی صحیح معنوں میں حقیقی اعتماد کے حامل قرار نہیں دیے جاسکتے جو دباؤ ڈال کر، یا مال سے خرید کر، یا جھوٹ اور مکر سے کام لے کر، یا لوگوں کو گمراہ کر کے نمائندگی کا مقام حاصل کریں۔
- چہارم یہ کہ مشورہ دینے والے اپنے علم اور ایمان و ضمیر کے مطابق رائے دیں، اور اس طرح کے اظہار رائے کی، انہیں پوری آزادی حاصل ہو۔ یہ بات جہاں نہ ہو، جہاں مشورہ دینے والے کسی لالچ یا خوف کی بنا پر، یا کسی جتھہ بندی میں کسے ہوئے ہونے کی وجہ سے خود اپنے علم اور ضمیر کے خلاف رائے دیں، وہاں در حقیقت خیانت اور غداری ہو گی نہ کہ أَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ کی پیروی۔
- پنجم یہ کہ جو مشورہ اہل شوری کے اجماع (اتفاق رائے) سے دیا جائے، یا جسے ان کے جمہور (اکثریت) کی تائید حاصل ہو، اسے تسلیم کیا جائے۔ کیونکہ اگر ایک شخص یا ایک ٹولہ سب کی سننے کے بعد اپنی من مانی کرنے کا مختار ہو تو مشاورت بالکل بے

معنی ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالی یہ نہیں فرمارہاہے کہ "ان کے معاملات میں ان سے مشورہ لیاجاتا ہے" بلکہ یہ فرمارہاہے کہ "ان کے معاملات آپس کے مشورے سے چلتے ہیں"۔ اس ارشاد کی تعمیل محض مشورہ لے لینے سے نہیں ہو جاتی، بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ مشاورت میں اجماع یا اکثریت کے ساتھ جو بات طے ہو اسی کے مطابق معاملات چلیں۔" (تفہیم القرآن ج 4ص510)

ایک صحیح جمہوری نظام میں یہ پانچوں شرائط پوری ہوتی ہیں جس کا تقاضا أَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ کی یہ آیت کرتی ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جمہوریت کی طرف یہ قدم نہایت ہی مثبت تبدیلی ہے۔

آزادی رائے

موجودہ دور آزادی رائے اور آزادی اظہار کا دور ہے۔ اہل مغرب نے اس قدر کو اپنے معاشروں میں اس قدر ترقی یافتہ بنالیاہے کہ اس کے نتیجے میں وہاں بالعموم کھل کر ہر معاملے میں اپنی رائے کا اظہار کیا جاسکتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کے ہاں بالخصوص مذہبی معاملات میں بعض لوگ اس آزادی کا غلط استعمال کر لیتے ہیں اور دوسروں کے جذبات کی دل آزاری کا باعث بنتے ہیں۔

قدیم مسلم معاشرے میں آزادی اظہار اپنے عروج پر تھی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کھلے عام ہر معاملے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے۔ یہاں تک کہ خلیفہ پر بھی کھلی تنقید کی جاتی۔ بنو امیہ کے دور میں ایک مخصوص دائرے کے علاوہ تقریباً یہی صورتحال رہی۔ بنو عباس کے دور سے مسلمانوں کے ہاں انسان کے اس حق پر حدود و قیود عائد ہونا شروع ہوئیں۔ موجودہ دور میں مسلم معاشروں کی بڑی تعداد اس حق سے محروم ہے۔ اکثر مقامات پر تو حکومت کی جانب سے پابندیاں عائد ہیں لیکن بعض ممالک جیسے پاکستان میں حکومت کی طرف سے تو کوئی خاص پابندیاں نہیں لیکن بہت سے ایسے پریشر گروپ موجود ہیں جو اہل علم کو آزادی اظہار کا حق دینے کو تیار نہیں اور اپنے مسلک یا نظریات کے خلاف اٹھنے والی ہر آواز کو خاموش کر دینے کے لئے کمربستہ رہتے ہیں۔

اگرچہ آزادی اظہار کے معاملے میں بھی مسلم ممالک مغربی ممالک سے بہت پیچھے ہیں لیکن ان میں سے اکثر کے ہاں بھی یہ حق دینے کا سلسلہ اور فکر کو آزاد کرنے کا عمل شروع ہو چکا ہے۔ جمہوریت کی طرح اس معاملے میں انہیں عالمی معیار تک پہنچنے کے لئے کئی عشرے درکار ہوں گے۔

بعض لوگ اظہار رائے کی اس آزادی کا غلط استعمال کرتے ہیں اور اس کے نتیجے میں دوسروں کی دل آزاری کا باعث بنتے ہیں۔ یہ طرز عمل درست نہیں تاہم اس سے آزادی اظہار کے اس حق کی نفی نہیں ہوتی۔ قرآن مجید میں واضح طور پر بتایا

گیاہے کہ "لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ" یعنی "دین میں کوئی جبر نہیں"۔ ہر شخص کو یہ آزادی حاصل ہے کہ وہ جس نقطہ نظر کو حق سمجھے، اسے اختیار کر لے کیونکہ قرآن مجید نے حق کو بالکل واضح کر دیا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو آزادی رائے کی یہ قدر بالکل مثبت تبدیلی ہے البتہ اس کا غلط استعمال برا ہے۔

سیکولرازم

عام طور پر سیکولر ازم کا معنی لادینیت سمجھا جاتا ہے۔ سیکولرازم کے حامیوں کے نزدیک یہ لادینیت کے مترادف نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مذہب اور ریاست کے معاملات کو الگ کر دیا جائے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ موجودہ معاشروں کی اکثریت متعدد مذاہب کے ماننے والوں پر مشتمل ہے۔ اگر کسی ایک مذہب کو یہ حق دیا جائے کہ وہ پبلک لاء بن کر دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کو متاثر کر سکے تو یہ مذہبی آزادی کے منافی ہو گا۔ اس کے نتیجے میں مذہبی اقلیتیں اس بات پر مجبور ہو جائیں گی کہ وہ ریاست کی وفادار شہری بن کر نہ رہیں۔

مغربی ممالک سیکولرازم کو پوری طرح اختیار کر چکے ہیں۔ ان کے ہاں سیکولرازم کے متعدد ماڈل موجود ہیں۔ ان میں ایک ماڈل فرانس (اور مسلم دنیا میں ترکی) کا ہے جس میں پبلک مقامات پر مذہبی علامات کے اظہار تک پر پابندی عائد کر دی گئی ہے۔ دوسری طرف امریکہ کا ماڈل ہے جہاں ہر مذہب کے ماننے والے کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کی مکمل آزادی ہے لیکن ریاست کے تمام تر معاملات میں مذہب کو استعمال نہیں کیا جاتا۔

مسلم ممالک کے ہاں اس معاملے میں متضاد رویے پائے جاتے ہیں۔ ایک گروہ کے نقطہ نظر کے مطابق مسلمانوں کو اجتماعی بنیادوں پر اپنا نظام صرف اور صرف اسلام کی بنیاد پر قائم کرنا چاہیے۔ اقلیتوں کو ان کے پرسنل لاء کی آزادی دی جائے لیکن پبلک لاء صرف اور صرف اسلام کا ہونا چاہیے۔ اسی نقطہ نظر کی بنیاد پر بہت سے مسلم ممالک میں اسلامی جماعتیں جدوجہد کر رہی ہیں۔ اسی نقطہ نظر کو سعودی عرب اور ایران کی حکومتوں نے مکمل طور پر اور پاکستان کے آئین میں جزوی طور پر اختیار کیا گیا ہے۔

دوسرا نقطہ نظر بالعموم مسلم حکمرانوں کا ہے۔ یہ لوگ عام طور پر سیکولر ذہن کے مالک ہیں اور سیکولرازم کو پسند کرتے ہیں۔ غیر مسلم ممالک میں موجود مسلم اقلیتیں سیکولرازم کی حامی ہیں اور ان کے مذہبی علماء اسی کی حمایت کرتے ہیں کیونکہ اس کے نتیجے میں انہیں مکمل مذہبی آزادی حاصل ہو جاتی ہے۔

اگر غیر مسلم ممالک میں مسلم اقلیتوں کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو سیکولرازم ایک مثبت تبدیلی ہے۔ مسلم اکثریتی ممالک میں اسے منفی تبدیلی سمجھا جاتا ہے۔ دین اسلام ہر غیر مسلم قوم کو اس کے پرسنل لاء کی آزادی دیتا ہے۔ عبادات، فیملی

لاء، وراثت اور بہت سے دیگر معاملات میں ہر غیر مسلم قوم کو اپنے عقیدے اور نظریے پر عمل کرنے کی مکمل آزادی دینا مسلمانوں کی حکومت پر لازم ہے۔ رہا سوال پبلک لاء کا جس میں وہ قوانین آتے ہیں جن کا تعلق بلا کسی مذہب کے تمام اقوام سے ہے۔ اس کی واضح مثال مملکت کا سیاسی نظام، اس کی معاشی پالیسی، عوام کو سہولیات فراہم کرنا، جرائم کی سزا، امن و امان وغیرہ کے مسائل ہیں۔

جب بھی کوئی قوم اپنے ملک کے پبلک لاء سے متعلق کوئی قانون سازی کرتی ہے تو وہ اپنی طرز معاشرت، تاریخ اور اقدار کو اہمیت دیتی ہے۔ اگر کسی ملک میں مسلمانوں کی اکثریت ہو تو یہ بالکل ہی نامعقول بات ہو گی کہ مسلمان قانون سازی میں اپنے طرز معاشرت، تاریخ اور اقدار کو مد نظر رکھتے ہوئے مذہب کو بالکل ہی نظر انداز کر دیں۔ ایسا مغربی ممالک میں بھی نہیں ہوتا اور ان کے ہاں بھی اکثریت کے مذہب یا روایات کو پبلک لاء سے متعلق قانون سازی میں اہمیت (Weightage) دی جاتی ہے۔ جمہوری نظام کا تقاضا یہ ہے کہ اکثریت کو اقلیتوں کے حقوق کا خیال کرتے ہوئے اپنی روایات اور مذہب کی بنیاد پر قانون سازی کا حق دیا جائے۔

اس وقت ضرورت اس امر کی ہے کہ سیکولر ازم کو اسلام سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس کے جو پہلو دین اسلام سے متصادم ہوتے ہیں، ان میں ضروری تغیر و تبدل کر کے انہیں دین اسلام کی تعلیمات سے ہم آہنگ کیا جائے۔ سیکولر ازم کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ دین کے بہت سے احکام مسلمانوں کو اجتماعی حیثیت سے دیے گئے ہیں۔ اگر ریاست کو مکمل طور پر لادین بنا دیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ لوگ اپنی انفرادی حیثیت میں تو اچھے مسلمان ہوں مگر اجتماعی طور پر وہ اللہ تعالی سے یہ کہہ رہے ہوں کہ ہم آپ کی بات نہیں مانیں گے۔ اس طرز عمل کو منافقت کے علاوہ شاید ہی کوئی نام دیا جا سکے۔

اس معاملے میں سب سے اچھی مثال ملائشیا نے قائم کی ہے۔ ان کے ہاں اسلامی قوانین کو مسلمانوں پر نافذ کیا جاتا ہے۔ غیر مسلم اقلیتوں کے لئے ان کے اپنے قوانین نافذ کیے جاتے ہیں یا پھر سیکولر قوانین موجود ہیں۔

ریاست کا معاشرے میں مذہبی کردار

سیکولر ازم سے متعلق ایک اور تبدیلی جدید سیاسی نظریے میں وقوع پذیر ہوئی ہے۔ یہ سوال بھی دور جدید میں پیدا ہو گیا ہے کہ کیا ریاست کو معاشرے میں مذہبی کردار ادا کرنا چاہیے؟ کیا ریاست کو اپنے شہریوں پر مذہب کو بزور طاقت نافذ کرنا چاہیے؟

جدید سیاسی نظریے میں اس سوال کا جواب نفی میں دیا گیا ہے۔ مغربی ممالک میں یہ دعوی کیا جاتا ہے کہ ریاست اپنے

شہریوں کے مذہبی معاملات میں کوئی مداخلت نہیں کرتی اگرچہ فرانس اور ترکی جیسے ممالک میں حقیقت اس کے برعکس ہے۔

مسلم ممالک میں اس معاملے میں دو نقطہ ہائے نظر موجود ہیں۔ ایک نقطہ نظر کے مطابق ریاست کو مذہب جبراً اپنے شہریوں پر نافذ کرنا چاہیے۔ روایتی مذہبی طبقہ بالعموم اسی نقطہ نظر کا حامی ہے۔ دوسرا گروہ جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں کا ہے جو اس معاملے میں مغربی نظریے کی حمایت کرتے ہیں۔ ایک تیسرا نقطہ نظر بھی اس معاملے میں موجود ہے جس کے مطابق ریاست کو مذہب جبراً نافذ کرنے کی بجائے دعوت و اصلاح کے ذریعے پھیلانا چاہیے اور اس ضمن میں سرکاری وسائل کو بھرپور استعمال کرنا چاہیے۔

اگر دین اسلام کا جائزہ لیا جائے تو یہ معلوم ہو گا کہ اس کا اہم ترین حصہ اخلاقیات پر مشتمل ہے۔ ان اخلاقیات کے بارے میں اسلام، دیگر مذاہب اور یہاں تک کہ لادین حلقوں میں بھی کوئی اختلاف موجود نہیں۔ دین اسلام میں ریاست پر یہ ذمہ داری عائد کی گئی ہے کہ وہ اپنے عوام کی اخلاقی اصلاح کے لئے کوشش کرے۔ اس کوشش کو "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" کا نام دیا گیا ہے۔

معروف سے مراد وہ نیکیاں ہیں جن کا نیکی ہونا انسانوں کے نزدیک مسلمہ حیثیت کا حامل ہو جیسے دیانت داری، عجز و انکسار، غرباء کی مدد وغیرہ۔ اسی طرح منکر سے مراد وہ برائیاں ہیں جو انسانوں کے نزدیک مسلمہ طور پر برائی سمجھی جاتی ہوں جیسے چوری، قتل، بددیانتی، جھوٹ وغیرہ۔ ظاہر ہے ان نیکیوں کی ترویج اور برائیوں کے خاتمے سے کسی غیر مسلم یا سیکولر شخص کو بھی کوئی اختلاف نہیں ہو سکتا ہے۔

دین اسلام کا دوسرا حصہ عقائد اور شریعت پر مشتمل ہے۔ اس حصے سے غیر مسلموں کو اختلاف رائے ہو سکتا ہے۔ شریعت کے معاملے میں مختلف مسلم فرقوں اور مسالک کے مابین اختلافات بھی موجود ہیں۔ اس معاملے میں یہ بحث کی جا سکتی ہے کہ حکومت کو اس معاملے میں کوئی کردار ادا کرنا چاہیے یا نہیں۔ ہماری رائے میں حکومت کو یہ معاملہ خود انجام دینے کی بجائے مختلف مذاہب کے ایسے اہل علم پر چھوڑ دینا چاہیے جو اپنے نقطہ نظر کو معقولیت سے بیان کرنے کی اہلیت رکھتے ہوں۔ اگر حکومت ایک مسلک کو بزور نافذ کرنے کی کوشش کرے تو اس کے نتیجے میں مختلف نقطہ نظر رکھنے والے فرقوں کی جانب سے بغاوت پیدا ہونے کا اندیشہ ہے جس کے نتیجے میں معاشرے کو سوائے انتشار کے کچھ اور حاصل نہ ہو گا۔

ہمارے نزدیک موجودہ دور میں پیدا ہونے والی یہ تبدیلی منفی نوعیت کی ہے کیونکہ اگر ریاست معاشرے میں مثبت اقدار کے فروغ کے لئے کام نہ کرے گی تو اس کے نتیجے میں معاشرے میں انتشار اور بگاڑ بڑھتا جائے گا۔ ہماری رائے میں حکومت کو اخلاقیات کے فروغ کی حد تک اپنا کردار ادا کرنا چاہیے۔ رہے دیگر مذہبی معاملات تو ان کو مذہبی علماء کے سپرد کر دینا چاہیے۔ اس معاملے میں مذہبی علماء کی تربیت کی ضرورت بھی ہے تا کہ وہ ان اختلافات کو بڑھا کر تفرقہ بازی کی سطح تک نہ لے

جائیں بلکہ مثبت انداز میں اختلافات کو مکالمے کے ذریعے حل کرنے کی اہمیت سے واقف ہوں۔

عالمگیریت(Globalization)

موجودہ دور کی ایک اہم تبدیلی عالمگیریت کی تحریک ہے۔ دنیا بھر میں یہ تحریک جاری ہے اور اس کے نتیجے میں پوری دنیا کی سیاست، معیشت اور معاشرت کو ایک کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ معاشی میدان میں اس تحریک کو ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن کی صورت میں کافی کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ معاشرت کے میدان میں بھی اس تحریک کو کسی قدر کامیابی حاصل ہوئی ہے مگر کسی حد تک ایک ملٹی نیشنل کلچر وجود پذیر ہو رہا ہے۔ سیاسی میدان میں اس تحریک کو اب تک کوئی قابل ذکر کامیابی حاصل نہیں ہو سکی۔

گلوبلائزیشن کی اس تحریک کے بالمقابل علاقائیت (Regionalism) کی تحریک بھی دنیا میں چل رہی ہے۔ اس تحریک کے نتیجے میں یورپی یونین کا بہت بڑا اتحاد معرض وجود میں آ چکا ہے۔ دنیا کے دوسرے خطوں میں بھی معاشی بنیادوں پر ممالک کو یکجا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ عالمگیریت کے خلاف اینٹی گلوبلائزیشن کی تحریک بھی موجود ہے جس میں مختلف سطحوں پر عالمگیریت کی مخالفت کی جا رہی ہے۔

ہماری رائے میں، معاشی گلوبلائزیشن کو ایک طرف رکھتے ہوئے، دیگر میدانوں میں پیدا ہونے والی یہ تبدیلی مثبت ہے۔ دینی نقطہ نظر سے اس تبدیلی کا مثبت پہلو یہ ہے کہ معاشروں کے اوپن ہونے کے نتیجے میں دین اسلام اور مثبت اقدار کی دعوت کو دنیا کے سامنے پیش کرنے کے بہت سے نئے مواقع پیش آ رہے ہیں۔

مذہبی جنگیں

بیسویں صدی کے وسط میں مسلمانوں کے اندر غلبہ اسلام کی تحریکیں پیدا ہوئیں۔ ان تحریکوں کا مقصد یہ رہا ہے کہ کسی بھی طریقے سے مسلم ممالک کی موجودہ حکومتوں کو ختم کر کے یہاں اسلامی حکومت قائم کی جائے۔ اس نقطہ نظر کے حاملین جلد ہی بہت سے حصوں میں تقسیم ہو گئے۔ بعض نے سیاسی جدوجہد کا راستہ اختیار کیا اور ان میں سے بعض مسلح جدوجہد کے راستے پر چل پڑے۔ اکیسویں صدی کے اوائل میں یہ مسلح جدوجہد عالمی سطح پر پھیل چکی ہے اور یہ مذہبی قوتیں بالخصوص عراق اور افغانستان میں امریکہ کے خلاف جنگ کر رہی ہیں۔ بہت سے دیگر مسلم ممالک میں صورتحال یہ ہے کہ وہ بھی اس جنگ کی لپیٹ میں آ سکتے ہیں۔

جدید دور میں پیدا ہونے والی یہ تبدیلی منفی نوعیت کی ہے۔ موجودہ دور میں تکنیکی اعتبار سے جنگ نہ صرف شکست خوردہ قوم کے لئے تباہی کا باعث ہے بلکہ اکثر اوقات فتح حاصل کرنے والی اقوام کے لئے بھی جنگ تباہی کا پیغام ہی لے کر آتی

ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں اگرچہ اتحادی قوتوں کو فتح حاصل ہوئی لیکن روس، برطانیہ اور فرانس میں ہونے والی تباہی، جرمنی، اٹلی اور جاپان کی تباہی سے کچھ کم نہ تھی۔ اسی تناظر میں دیکھا جائے تو موجودہ جنگوں کے نتیجے میں جہاں مسلم ممالک (جیسے افغانستان اور عراق) تباہی کا شکار ہوں گے وہاں ان کا مقابلہ کرنے والے غیر مسلم ممالک (جیسے امریکہ اور برطانیہ) بھی کچھ کم نقصان سے دوچار نہ ہوں گے۔

اس صورتحال سے نمٹنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ مسلم اور غیر مسلم ممالک دونوں میں امن کی اہمیت اجاگر کی جائے اور انہیں تصادم سے روکا جائے کیونکہ یہ تصادم دونوں کے لئے ہی مہلک ثابت ہو گا۔

خلاصہ بحث

سیاسی میدان میں رونما ہونے والی تبدیلیوں میں مثبت اور منفی دونوں رجحانات پائے جاتے ہیں۔ بعض تبدیلیاں منفی نوعیت کی ہیں جبکہ بعض مثبت نوعیت کی۔

جاری ہے۔۔۔

مصنف کی دیگر تحریروں کا مطالعہ کرنے کے لیے وزٹ کیجیے: www.mubashirnazir.org
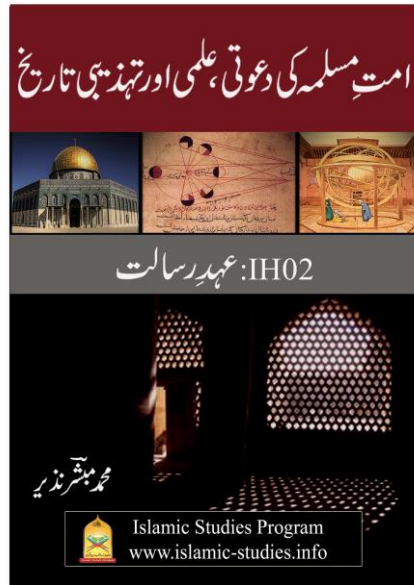
رفعت نواب مصعب

سورۃ الفاتحہ انسانیت کی دعا

سورۃ الفاتحہ کو انسانیت کی دعا کہا جاتا ہے۔ یہ دعا اللہ رب العزت نے خود اپنے بندوں کو سکھائی ہے تا کہ انسانیت کو معلوم ہو کہ اپنے پرودر گار سے کس طرح رابطہ کرنا ہے۔ بحیثیت مسلمان ہم ہر نماز کی ہر رکعت میں اس سورۃ کے ذریعے اللہ سے دعا و مناجات کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس سورۃ کا اسلوب اور انداز ایسا رکھا ہے جیسا کہ کسی بھی رجوع الی اللہ رکھنے والے انسان کا ہونا چاہئے۔ چنانچہ اس دعا کے ذریعے سے انسان اپنے پروردگار سے براہ راست مخاطب ہوتا ہے۔ وہ نہ صرف یہ کہ اس سورۃ کے الفاظ کے ذریعے اللہ کی ربوبیت کا اعتراف کرتا ہے بلکہ اسے رب العالمین کی حیثیت سے یاد کرتے ہوئے اس کی برستی ہوئی رحمت اور ابدی مہربانیوں کا معترف ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسے منیب بندے کی دعا ہے جسے یہ بھی یقین ہوتا ہے کہ یہ زندگی خواہ جیسے حالات بھی ہوں، گذر ہی جائے گی لیکن بالآخر حاضری اسی رب العالمین کے سامنے ہو گی جس نے یہ امتحان کی زندگی عنایت کی تھی، اس حاضری کا ایک دن مقرر ہے، جسے حساب کتاب یعنی بدلے کا دن کہا گیا ہے۔ قران مجید میں اس دن کو یوم التغابن بھی کہا گیا ہے یعنی ہار اور جیت کا دن، جو اس دن جیت گیا وہ ہمیشہ کے لئے جیت جائے گا اور جو اس دن ہار گیا وہ کبھی جیت نہ پائے گا۔ اُس دن کے سارے اختیارات اس اللہ کے ہاتھ میں ہوں گے، جسے شروع میں رب العالمین کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ اس دن کوئی بھی شخص کسی دوسرے کے بارے میں کوئی اختیار رکھنے کا دعویٰ نہیں کر سکے گا، سارا اقتدار اور سارا اختیار ایک اللہ کے ہاتھ میں ہو گا۔

اب اس دن کی کامیابی کے حصول اور نامرادی سے بچاؤ کیلئے ضروری ہے کہ انسان صرف اور صرف اپنے ایک رب کی ہی عبادت کرے اور اس کی عبادت میں کسی کو کسی بھی لحاظ سے شریک نہ کرے اور زندگی کہ ہر مشکل، ہر مصیبت میں صرف اسی ایک اللہ کو اپنا مشکل کشا، حاجت روا، مجیب الدعوات اور سمیع الدعا سمجھتے ہوئے صرف اسی سے بغیر کسی واسطے وسیلے کے استعانت و امداد کا طلبگار بنے۔

اُس جزا و سزا کے دن کی ناکامی سے بچنے کیلئے ضروری ہے کہ صراطِ مستقیم کو اختیار کیا جائے اور صراطِ مستقیم وہی ہو گا جو اللہ نے خود انسانیت کیلئے مقرر فرمادیا ہے نہ کہ انسانوں کے بنائے ہوئے خود ساختہ رستے۔ اسی لئے وضاحت فرمادی گئی ہے کہ سیدھا رستہ وہ ہے جسے اللہ کے حکم سے اس کے انعام یافتہ بندوں نے اختیار کیا یعنی انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین نے۔ اس لئے جب بھی انسان اللہ سے سیدھے رستے کی دعا کرتا ہے تو مالک اس کے سامنے قرآن کی شکل میں گذشتہ انعام یافتہ اور

رضا یافتہ انسانوں کی زندگیاں، ان کی دعوت، دین حق پر ان کا صبر واستقامت اور مخالفین کی ہر مخالفت، مزاحمت اور استہزاء پر ان سے اعراض کرنے اور اللہ کی طرف انابت کے رویے کو انسانیت کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ نوح، ھود، صالح، ابراہیم، لوط، یوسف، موسیٰ، شعیب اور عیسیٰ علیہم السلام کی پوری پوری دعوتی سرگزشت کو اسی لئے پیش کیا گیا ہے۔ ان کے بعد نیک لوگوں کی دعوت واستقامت کے نمونے کے طور پر موسیٰ علیہ السلام کے دور رجلِ مومن، اصحابِ کہف اور اصحابُ الاُخدود کو بھی اسی لئے پیش کیا گیا ہے۔ اللہ کے ایک منیب بندے کے سامنے ان کا کردار ہمیشہ موجود رہنا چاہئے۔

فلاح کے حصول کیلئے جس طرح انعام یافتہ بندوں کے رستے کو اپنانا ضروری ہے اسی طرح ان لوگوں کے رستے اور روش سے گریز بھی ضروری ہے جو اللہ کے غضب اور عذاب کا اس دنیا میں بھی شکار ہوتے رہے اور اُخروی زندگی میں بھی ہمیشہ کا عذاب بھی ان کیلئے تیار ہے۔ اسی طرح ان لوگوں کے رستے اور طریقے سے بچنا بھی ضروری قرار دے دیا گیا جو گمراہ ہو گئے تھے خواہ یہ گمراہی قصداً اختیار کی گئی تھی یا گمراہ اکابرین کی رہنمائی انہیں اس گمراہی تک لے آئی تھی۔ جب ایک بندہ اللہ سے دعا کرتا ہے کہ مجھے غضب یافتہ اور گمراہ قوموں کے رستے سے بچا، تو اللہ تعالی نے اپنی کتاب میں ان تمام عذاب یافتہ گمراہ اقوام کے کردار کی تاریخ بیان فرمادی۔

اس طرح معلوم ہوا کہ سورۃ فاتحہ انسانیت کیلئے ایک ایسے جامع دعا ہے جس کو مانگنے والا اگر صدقِ دل سے یہ مانگے تو وہ کبھی اللہ کی عطا سے محروم نہیں رہ سکتا۔ جس چیز کی وہ دعا کرتا ہے وہ رستے اور طریقے اللہ نے اپنی کتاب میں کھول کر بیان فرمادئے ہیں اس کے آخری رسول محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی سنت کے ذریعے اس پر عمل کی تاریخ رقم فرمادی ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس قرآن اور سنت کی عملی تعبیر بنے ہیں۔ اب ذمہ داری دعا کرنے والے کی ہے کہ کہ وہ صرف دعا کی حد تک ہی محدود رہتا ہے یا عملی میدان میں بھی اترتا ہے۔ اللہ کا فرمان تو واضح ہے:

إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا ہم نے اسے خیر و شر کی راہ سجھادی۔ اب وہ چاہے شکر کرے یا کفر کرے۔
[الدھر: 3]

اللھم اھدنا الصراط المستقیم

تنویر احمد مغل

غیب پر ایمان

غیب عربی زبان کا لفظ ہے۔ اس کا مطلب 'پوشیدہ' ہے۔ انسان اپنے اندر موجود حواس کے ذریعے چیزوں کو پہچانتا اور سمجھتا ہے۔ انسان کی مجبوری یہ ہے کہ جب تک کوئی چیز اس کے مشاہدے یا تجربے سے نہ گزرے تب تک وہ اس کا تصور بھی قائم نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالی کی قدرت، اس کی ذات، جنت، جہنم اور دیگر مخلوقات وغیرہ کا انسان تصور بھی قائم نہیں کر سکتا جب تک ان کو دیکھ نہ لے۔

اللہ تعالی جب کسی پیغمبر کو مبعوث فرماتا ہے تو وہ سب سے پہلے اپنے معجزات کے ذریعے انسان کو یقین دلاتا ہے کہ وہ اللہ کا سچا پیغمبر ہے۔ اس کے بعد پھر وہ لوگوں کو غیب کی خبریں دیتا ہے۔ جو لوگ پیغمبر کو عقلی طور پر پر اللہ کا نمائندہ تسلیم کر چکے ہوتے ہیں وہ پھر اس بات پر ایمان لاتے ہیں کہ چونکہ یہ سب ہمارے رب کی طرف سے ہے تو یہ لازماً سچ ہی ہو گا۔ اس کو ایمان بالغیب کہتے ہیں یعنی بغیر سمجھے نہیں بلکہ بغیر دیکھے ایمان لانا۔ یہ معاملہ صرف مذہبی مقدمہ کے ساتھ ہی نہیں بلکہ روزمرہ کی اور بھی چیزوں میں ہمیں اس سے سابقہ پیش آتا ہے۔ مثلاً ہوا کو لے لیجئے، ہم اسے دیکھ نہیں سکتے اور اگر ساکت ہو تو محسوس بھی نہیں کر سکتے۔ لیکن سائنس نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ ہوا ہر جگہ موجود ہے۔ البتہ اگر ہوا نہ ہو تو ہم سانس ہی نہ لے سکیں۔ یہی معاملہ جراثیم کا بھی ہے۔ لیکن یہ چیزیں چونکہ ایسی نوعیت کی ہیں جن کو انسان ہر بار تجربہ کے ذریعہ ثابت کر سکتا ہے۔ اس لیے لوگ اسے آسانی سے تسلیم کر لیتے ہیں۔ آخرت کے معاملہ میں چونکہ یہ تجربہ ہر بار ممکن نہیں اور عام مشاہدہ یہی ہے کہ روایتی علماء نے اس ضمن میں جب بھی ناقدین کی طرف سے کوئی سوال موصول کیا تو اس 'سوال پوچھنے' کو شرارت اور بدنیتی پر محمول کر کے نظر انداز کر دیا۔ جس وجہ سے یہ عام تاثر لوگوں میں پایا جاتا ہے کہ شاید آخرت کا تصور پیش کرنے والوں کے پاس اس دعویٰ کے دلائل ہی موجود نہیں۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ علمی طریقہ سے اس سب کا جواب قران و سنت کی روشنی میں دیا جائے اور اپنے ذاتی فلسفہ کو حد درجہ اس میں شامل ہونے سے بچایا جائے۔ ہم دیکھیں گے کہ قران اپنی بات کو خود ہی تسلیم کرا لے گا۔

ڈاکٹر محمد عقیل

حق جماعت یا مسلک کی تلاش کس طرح کی جائے؟

عام طور پر یہ سوال کیا جاتا ہے کہ آج کے دور میں وہ جماعت یا مسلک کس طرح تلاش کیا جائے جو حق پر ہو؟ لیکن بالعموم ہم جب حق کی تلاش کی بات کرتے ہیں تو اسے محدود معنوں میں لیتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ حق کی تلاش سے مراد کسی ایسے مخصوص فرقے، مسلک یا جماعت سے وابستگی اختیار کرنا ہے جو سر تا سر حق پر ہو۔ یہ بات پیغمبروں کی موجودگی کی حد تک تو درست معلوم ہوتی ہے کیونکہ پیغمبر اللہ کے نمائندے ہوتے ہیں اور ان کی موجودگی میں انہی کی جماعت حق پر ہوتی ہے اور اس کی تائید اللہ کی وحی بھی کرتی ہے۔ پیغمبر کی موجودگی میں حق پیغمبر ہی کے ساتھ ہوتا ہے اور حق کا حصول اسی وقت ممکن ہے جب پیغمبر کی کی جماعت میں شمولیت اختیار کرلی جائے۔ جب پیغمبر یہ اعلان کرتا ہے کہ وہ حق ہے تو اس اعلان کے پیچھے اللہ کا حکم موجود ہوتا ہے۔

پیغمبروں کے بعد ان کے ماننے والے تعداد میں بالعموم بڑھ بھی جاتے ہیں اور ان میں دین کے فہم کے حوالے سے اختلاف رائے بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ اس لیے کسی بھی فرقے یا مسلک کے لیے یہ کہنا ممکن نہیں کہ تمام حق ان کے پاس ہے اور باقی جماعتیں یا مسالک مکمل طور پر کفر یا باطل پر کھڑے ہیں۔ چنانچہ عین ممکن ہے کہ حق مختلف مسالک میں بکھرا ہوا ہو۔ ایسی صورت میں اہمیت اس بات کی ہوتی ہے کہ حق بات اور حق نظریے کو مانا جائے اور کسی شخصیت یا جماعت یا مسلک کو پیغمبر یا سراپا حق نہ سمجھا جائے۔ اس تناظر میں یہ رویہ درست نہیں کہ حق کو تلاش کرنے سے مراد ایک ایسی جماعت لی جائے جو سراپا حق ہو۔ البتہ یہ عین ممکن ہے کہ ایک جماعت بحیثیت مجموعی حق کے قریب تر ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ پیغمبر کی موجودگی میں جماعت میں شمولیت اختیار کرنا لازم ہوتا ہے کیونکہ حق اس جماعت کے ساتھ کھڑا ہوتا ہے۔ پیغمبر کے بعد پیغمبر کی تعلیمات کی صورت میں حق موجود ہوتا ہے جو ضروری نہیں صرف ایک ہی جماعت یا مسلک کے پاس ہو۔ ایسی صورت میں حق پر عمل کرنے کے لیے کسی جماعت یا عالم کی اندھی پیروی کی بجائے ان تعلیمات کو جاننا اور ماننا لازمی ہوتا ہے جو پیغمبر کی اصل ہدایات ہوں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کسی کو اگر کوئی جماعت یا مسلک یا عالم یا فکر کو منتخب کرنا ہے تو کس طرح کرے؟ اس کا جواب بہت سادہ ہے:

۱۔ سب سے پہلے تو ایک شخص جس جماعت میں ہے اسی جماعت میں رہے اور ہر وقت اپنے کان، آنکھ اور ذہن کھلا رکھے۔

۲۔ اپنی جماعت کے علما کی رائے کو عقل و فطرت اور قرآن و سنت کی روشنی پر جانچے اور اختلاف پیدا ہونے کی صورت میں تحقیق کرے۔

۳۔ جونہی اسے اپنی جماعت اور مسلک کے بارے میں کوئی سوال یا اعتراض پیدا ہو تو اس پر تحقیق کرے اور یہ تحقیق صرف اپنی جماعت کے علما اور اپنے مسلک ہی کی کتابیں پڑھ کر نہ کرے بلکہ دوسرے مسلک کی رائے کو بھی بلا تعصب جانے۔

۴۔ اگر اس پر واضح ہو جائے کہ اس کی جماعت یا مسلک کا نقطہ نظر درست نہیں تو وہ حق پر مبنی نقطہ نظر ہی اختیار کرے۔

۵۔ اپنی جماعت یا مسلک کے علماء اور انتظامیہ کی اخلاقی حالت اور کردار پر ہمیشہ نظر رکھے۔ اگر اس میں کوئی خرابی دیکھے تو برملا ادب کے ساتھ بتا دے۔ اور اگر وہ علماء رجوع نہ کریں تو وہ ان سے کنارہ کشی اختیار کر لے۔

۶۔ اگر اپنی جماعت یا مسلک کے نظریات اور علماء سے مجموعی طور پر علمی اطمینان نہ ہو تو اس جماعت سے کنارہ کش ہو جائے۔

۷۔ یہ بات ہمیشہ یاد رکھے کہ حق اللہ اور اس کے پیغمبر کی تعلیمات کا نام ہے، کسی جماعت، فرقے، مسلک یا علماء اور اسکالرز کا نام نہیں۔

مومن کے جان، مال اور آبرو کی حرمت

عبدالرحمٰن بن ابی بکرہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں، وہ ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر کرنے لگے کہ آپ ﷺ اپنے اونٹ پر بیٹھے تھے اور ایک شخص اس کی نکیل پکڑے ہوئے تھا، آپ نے صحابہ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ یہ کون سا دن ہے؟ ہم لوگ خاموش رہے، یہاں تک کہ ہم نے خیال کیا کہ عنقریب آپ ﷺ اس کے (اصلی) نام کے سوا کچھ اور نام بتائیں گے، آپ ﷺ نے فرمایا کیا یہ قربانی کا دن نہیں ہے؟ ہم نے عرض کیا کہ ہاں، پھر پوچھا کہ یہ کون سا مہینہ ہے؟ ہم نے پھر سکوت کیا یہاں تک کہ ہم نے خیال کیا کہ شاید آپ اس کا نام دوسرا بتائیں گے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ کیا یہ ذی الحجہ نہیں ہے؟ ہم عرض کیا کہ ہاں، (اس کے بعد) آپ ﷺ نے فرمایا کہ تمہارے خون، تمہارے مال اور تمہاری آبروئیں آپس میں اسی طرح حرام ہیں، جیسے تمہارے اس دن میں، تمہارے اس مہینے میں، تمہارے اس شہر میں حرام (سمجھے) جاتے ہیں، چاہیے کہ حاضر غائب کو (یہ خبر) پہنچا دے اس لیے کہ شاید حاضر ایسے شخص کو (یہ پیغام پہنچا دے) جو اس سے زیادہ محفوظ رکھنے والا ہو۔ (صحیح بخاری، حدیث نمبر 67)

محمد مبشر نذیر

الحاد جدید کے مسلم اور مغربی معاشروں پر اثرات (پارٹ4)

الحاد کی سائنسی اساسات کا انہدام

انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے نصف اول کا زمانہ الحاد کے عروج کا دور ہے۔ اسی دور میں وہ سائنسی تحقیقات ہوئیں جنہوں نے الحادی نظریات کی توجیہ پیش کی۔ اسی دور میں الحادی نظریات اور نظام ہائے حیات کو دنیا بھر میں فروغ ملا، اسی عرصے کے دوران دنیا بھر کے انسانوں نے اپنی زندگیوں میں مختلف درجوں پر الحاد کو قبول کیا۔ کوئی الحاد کو نظریاتی طور پر بھی مان کر خالص ملحد اور دہریہ بنا اور کسی نے صرف اس کے عملی اثرات کو قبول کرنے پر اکتفا کیا۔ بیسویں صدی کے نصف آخر سے الحاد کا زوال شروع ہوا۔

دور قدیم کے ملحدین کے پاس الحاد کی کوئی ٹھوس منطقی دلیل نہیں ہوا کرتی تھی۔ انیسویں صدی میں کچھ ایسے سائنسی نظریات وجود میں آئے جنہوں نے الحاد کو کسی حد تک سپورٹ کیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان میں کسی کی حیثیت بھی سائنسی قانون (Law) یا مسلمہ کی نہیں تھی۔ یہ سب کے سب ابھی نظریے (Theory) کے درجے پر تھے۔ ان نظریات کا ایک مختصر جائزہ ہم پیش کر چکے ہیں، یہاں ہم ہارون یحییٰ کے مضمون The Fall of Atheism سے ان سائنسی تحقیقات کا اجمالاً ذکر کریں گے جنہوں نے الحاد کی ان سائنسی بنیادوں کو منہدم کیا۔ ان نظریات میں ڈارون کا نظریہ ارتقاء، فرائڈ کا نظریہ جنس، مارکس اور اینجلز کے معاشی نظریات اور ڈرخم کے عمرانی نظریات شامل ہیں۔ جو صاحب ان کی تفصیل جاننا چاہیں، وہ اس آرٹیکل کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ یہ آرٹیکل ان کی ویب سائٹ www.harunyayha.org پر بھی میسر ہے۔ ان سائنسی اساسات کے انہدام پر جارج واشنگٹن یونیورسٹی کے پروفیسر پیٹرک گلائن کا تبصرہ بڑا معنی خیز ہے:

> پچھلے دو عشروں کی ریسرچ نے جدید سیکولر اور ملحد مفکرین کی پچھلی نسل کے تمام مفروضات اور پیش گوئیوں کو گرا کر رکھ دیا ہے جو انہوں نے خدا کے وجود کے بارے میں قائم کئے تھے۔ جدید (ملحد) مفکرین نے یہ فرض کر رکھا تھا کہ سائنس پر مزید تحقیقات اس کائنات کو بے ترتیب (Random) اور میکانکی ثابت کر دیں گی؛ لیکن اس کے برعکس جدید سائنسی تحقیقات نے کائنات کو غیر متوقع طور پر ایسا منظم نظام ثابت کیا ہے جو کہ ایک ماسٹر ڈیزائن کی بنیاد پر تیار کیا گیا ہو۔ ماڈرن (ملحد) ماہرین نفسیات یہ پیش گوئی کر رہے تھے کہ مذہب محض ایک دماغی خلل یا نفسیاتی بیماری ثابت ہو جائے گا لیکن انسان کا مذہب کے ساتھ تعلق مشاہدے اور تجربے کی روشنی میں دماغی صحت کا اعلیٰ ترین نمونہ ثابت ہوا ہے۔ اس حقیقت کو ابھی صرف چند لوگ ہی تسلیم کر رہے ہیں لیکن یہ بات اب واضح ہو جانی چاہئے کہ مذہب اور سائنس میں ایک صدی کی بحث کے بعد اب پانسہ مذہب کے حق میں پلٹ چکا ہے۔ ڈارون کے نظریے کے فروغ کے دور میں، ملحدین اور متشککین جیسے ھکسلے اور رسل یہ کہہ سکتے تھے کہ زندگی اتفاقی طور پر وجود میں آئی اور کائنات محض ایک اتفاق

ہی سے بنی۔ اب بھی بہت سے سائنس دان اور دانشور اسی نقطہ نظر کو مانتے ہیں لیکن وہ اس کے دفاع میں اب بے تکی باتیں کرنے پر ہی مجبور ہیں۔ آج حقائق کے مضبوط اعداد و شمار یہی ثابت کرتے ہیں کہ خدا کے موجود ہونے کا نظریہ ہی درست ہے۔

(Patrick Glynn, God: The Evidence, The Reconciliation of Faith and Reason in a Postsecular World , Prima Publishing, California, 1997, pp.19-20, 53)

بگ بینگ کا نظریہ

اب تک دنیا میں یہ مانا جارہا تھا کہ یہ کائنات ہمیشہ سے موجود ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ اس نظریے کو جدید دنیا میں جرمن فلسفی عمانویل کانٹ نے پیش کیا۔ یہ سمجھا جانے لگا کہ اس کائنات کو کسی نے تخلیق نہیں کیا بلکہ یہ ہمیشہ سے ایسے ہی ہے۔

بیسویں صدی میں فلکیات (Astronomy) کے میدان میں جدید علمی تحقیقات نے اس نظریے کو غلط ثابت کر دیا۔ 1929 میں امریکی ماہر فلکیات ایڈون ہبل نے دریافت کیا کہ کہکشائیں مسلسل ایک دوسرے سے دور ہو رہی ہیں۔ اس سے سائنس دانوں نے یہ اخذ کیا کہ ماضی میں کسی وقت یہ کہکشائیں اکٹھی تھیں۔ اس وقت یہ کائنات توانائی کے ایک بہت بڑے گولے کی شکل میں موجود تھیں جو ایک بہت عظیم دھماکے (Big Bang) کے نتیجے میں مادے کی صورت اختیار کر گیا۔ ملحد مفکرین نے اس نظریے کو ماننے سے انکار کر دیا لیکن مزید سائنسی تحقیقات نے اس نظریے کو تقویت دی۔ 1960 کے عشرے میں دو سائنس دانوں ارنو پینزیاز اور رابرٹ ولسن نے دھماکے کے نتیجے میں بننے والی Cosmic Background Radiation کو دریافت کیا۔ اس مشاہدے کی تصدیق 1990 میں Cosmic Background Explorer Satellite کی ذریعے کی گئی۔ اس صورتحال میں انتھونی فلیو جو کہ یونیورسٹی آف ریڈنگ میں فلسفے کے ایک ملحد پروفیسر ہیں، کہتے ہیں:

> اعتراف روح کے لئے اچھی چیز ہے۔ میں اس اعتراف سے آغاز کرتا ہوں کہ علم فلکیات میں اس اتفاق رائے سے ایک ملحد کے نظریات پر زد پڑتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ فلکیات دان اس بات کو سائنسی طور پر ثابت کرنا چاہتے ہیں جو سینٹ تھامس فلسفیانہ طور پر ثابت نہ کر سکے یعنی یہ کہ اس کائنات کی کوئی ابتدا ہے۔ اس سے پہلے ہم یہ اطمینان رکھتے تھے کہ اس کائنات کی نہ تو کوئی ابتدا ہے اور نہ کوئی اختتام------اب یہ کہنا بگ بینگ تھیوری کے سامنے آسان نہیں۔

Henry Margenau, Roy Abraham Vargesse, Cosmos, Bios, Theos, La Salle IL: Open)
(Court Publishing, 1992, p.241

جان میڈکس جو کہ ایک ملحد ہیں اور Nature کے نام سے رسالہ نکالتے ہیں، نے اس نظریے کو اس بنیاد پر رد کر دیا کہ اس سے خدا کو ماننے والوں کو حجت مل جائے گی۔ انہوں نے امید ظاہر کی کہ یہ نظریہ دس سال سے زیادہ نہیں چل سکے گا لیکن مزید تحقیقات نے اس نظریے کو اور تقویت دی۔ برطانوی ملحد اور ماہر طبیعات ایچ پی لیپسن لکھتے ہیں:

میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں اس بات کا اعتراف کر لینا چاہئے کہ قابل قبول تشریح یہی ہے کہ اس کائنات کو تخلیق کیا گیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ یہ ملحدین کی زبان بند کر دے گی جیسا کہ میرے ساتھ ہوا لیکن ہمیں کسی چیز کو صرف اس بنیاد پر رد نہیں کر دینا چاہئے کہ ہم اسے پسند نہیں کرتے اگرچہ تجربہ اور مشاہدہ اسے ثابت کر رہا ہو۔

H. P. Lipson, "A Physicist Looks at Evolution", Physics Bulletin, vol. 138, 1980, p. 138)

کائنات کا انٹیلی جنٹ ڈیزائن

کائنات کے متعلق اہل الحاد کا ایک اور نظریہ بھی تھا اور وہ یہ تھا کہ یہ کائنات بے ترتیب (Random) ہے۔ اس میں موجود مادے، اجرام فلکی اور جن قوانین کے تحت یہ چل رہے ہے، کا کوئی مقصد نہیں بلکہ یہ محض اتفاق ہی ہے۔ 1970 کے عشرے میں سائنس دانوں نے یہ دریافت کیا کہ کائنات میں ایسا توازن (Balance) پایا جاتا ہے جس میں اگر ذرا سا بھی ہیر پھیر ہو تو اس میں انسانی زندگی ممکن ہی نہ ہو سکے۔ تمام طبیعی، کیمیائی اور حیاتیاتی قوانین، کشش ثقل اور مقناطیسی قوتیں، ایٹمز اور مالیکیولز کی ساخت، عناصر اور مرکبات کی موجودگی یہ سب کا سب بالکل اسی طرح اس کائنات میں موجود ہے جیسا کہ انسانی زندگی کی ضرورت ہے۔ سائنس دانوں نے اس غیر معمولی ڈیزائن کو Anthropic Principle کا نام دیا۔ ان کے مطابق اگر بگ بینگ کے وقت دھماکے کی شدت، مادے کے پھیلنے کی رفتار میں ذرا سا بھی فرق پڑ جاتا تو یا تو مادہ دوبارہ جڑ جاتا یا پھر اتنا زیادہ پھیل جاتا کہ موجودہ حالت میں کسی طور پر آ ہی نہ سکتا، اس طرح انسانی زندگی کبھی ممکن نہ ہوتی۔

زمین کا سائز، سورج کا سائز، سورج اور زمین کا فاصلہ، پانی کی طبعی اور کیمیائی خصوصیات، سورج کی شعاعوں کی ویولینتھ، زمین کی فضا میں موجود گیسیں اور کشش ثقل سب کی سب اسی تناسب میں موجود ہیں جو انسانی زندگی کے لئے ہونا چاہئے تھا۔ اگر اس میں سے کسی میں 1/1039 کے برابر بھی فرق پڑ جاتا تو انسانی زندگی ممکن نہ ہوتی۔ کیا ایسا کسی مافوق الفطرت ہستی کی مداخلت کے بغیر ممکن تھا؟ کیا دنیا میں کبھی ایسا ہوا کہ ہوا میں ریت، بجری اور سیمنٹ کو یونہی اچھال دیا جائے اور وہ جب زمین پر بیٹھے تو ایک خوبصورت بنگلے کی صورت اختیار کر جائے جو انسانی رہائش کے لئے موزوں ترین ہو یا پھر روشنائی کے قطروں کو اچھال دیا جائے اور جب وہ نیچے گریں تو غالب کی غزل لکھی ہوئی ہو۔ شاید ایسا صرف کارٹون فلموں ہی میں ممکن ہے لیکن حقیقی دنیا میں اس کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے۔ ایک منظم نتیجہ حاصل کرنے کے لئے کسی برتر ہستی کی موجودگی ضروری ہوا کرتی ہے۔ ان حقائق نے بہت سے سائنس دانوں جیسے پال ڈیوس، ڈبلیو پریس، جارج گرین اسٹائن اور مالیکیولر بائیولوجسٹ مائیکل ڈینٹن کو کسی برتر ہستی کا اعتراف کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔

ڈارون کے نظریے کی تردید

جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے کہ الحاد کو سب سے زیادہ سپورٹ ڈارون کے نظریہ ارتقا سے ملی ہے۔ ڈارون کے مطابق تمام جاندار اشیا بے جان مادے سے ایک ارتقائی عمل کے تحت بنی ہیں۔ سب سے پہلے ایک خلیے پر مشتمل سادہ جاندار وجود میں آئے اور پھر یہ لاکھوں سال میں نسل در نسل ارتقا پذیر ہو کر اعلیٰ جانوروں کی شکل اختیار کرتے گئے۔ بیسویں صدی میں پیلی انٹالوجی کے میدان میں قدیم ترین فوسلز پر ریسرچ سے نظریہ ارتقا کسی طرح بھی ثابت نہ ہو سکا۔ یہ ریسرچ محض دو جانوروں کے درمیان ارتقا کی کڑیوں کو جوڑنے میں ناکام رہی۔

اسی طرح جانوروں کی نسلوں میں کئی عشروں تک تبدیلیوں کے مطالعے سے سائنس دان اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ کسی بھی نوع (Specie) میں تبدیلیاں مخصوص جینیاتی حدود (Genetic Boundries) سے باہر نہیں جاتیں۔ انسانی آنکھ سے لیکر پرندوں کے پروں تک کسی بھی جاندار کے جسم کا ہر حصہ اتنی sophisticated technology سے بنا ہوتا ہے کہ اس کا تقابل کسی بھی جدید مشینری سے کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے یہ ماننا بہت مشکل ہے کہ یہ سب کچھ محض اتفاق ہی سے اندھے قوانین کے تحت بن گیا۔ ان تمام تحقیقات کے نتیجے میں اب مغربی سائنس دانوں میں Intelligent Design کا نظریہ فروغ پا رہا ہے۔

سگمنڈ فرائڈ کے نظریات کی تردید

نفسیات کے میدان میں الحاد کی اساسات سگمنڈ فرائڈ کے نظریات پر قائم تھیں جو کہ آسٹریا کے ماہر نفسیات تھے۔ فرائڈ مذہب کو محض ایک نفسیاتی بیماری قرار دیتے تھے اور ان کا خیال یہ تھا کہ وقت کے ساتھ ساتھ انسان جیسے جیسے ترقی کرے گا، یہ مرض دور ہو جائے گا۔ ماہرین نفسیات میں الحاد بہت تیزی سے پھیلا۔ 1972 میں امریکن سائیکالوجی ایسوسی ایشن کے ممبرز کے مابین ایک سروے کے مطابق ماہرین نفسیات میں صرف 1.1٪ ایسے تھے جو کسی مذہب پر یقین رکھتے ہوں۔ انہی ماہرین نفسیات نے طویل عرصے تک لوگوں کی نفسیات کا مطالعہ کرنے کے بعد جو رائے قائم کی، وہ پیٹرک گلائن کے الفاظ میں کچھ یوں تھی:

> نفسیات کے میدان میں پچیس سالہ ریسرچ نے یہ ظاہر کیا ہے کہ فرائڈ اور ان کے پیروکاروں کے خیال کے برعکس، مذہب پر ایمان ذہنی صحت اور خوشی کے اہم ترین اسباب میں سے ایک ہے۔ ریسرچ پر ریسرچ یہ ثابت کرتی ہے کہ مذہب پر ایمان اور اس پر عمل انسان کو بہت سے غیر صحت مندانہ رویوں جیسے خودکشی، منشیات کے استعمال، طلاق، ڈپریشن اور شادی کے بعد جنسی عدم تسکین سے بچاتا ہے۔ مختصراً، مشاہداتی ڈیٹا پہلے سے فرض کردہ سائیکو تھیراپی اجماع سے بالکل مختلف نتائج پیش کرتا ہے۔

Patrick Glynn, God: The Evidence, The Reconciliation of Faith and Reason in a (Postsecular World , Prima Publishing, California, 1997, pp.60-61

کمیونزم کا زوال

معاشیات کے میدان میں الحاد کی سب سے بڑی شکست کمیونزم کا زوال ہے۔ کمیونزم جو دنیا میں الحاد کا سب سے بڑا داعی تھا، بالآخر اپنے دو بنیادی مراکز روس اور چین میں دم توڑ گیا۔ لینن نے اپنے تئیں خدا کو سوویت یونین سے نکال دیا تھا لیکن خدا نے اس کے غرور کا خاتمہ کر ہی دیا۔ کمیونزم کے آخری دور میں روسی عوام اور آخری صدر گورباچوف کو خدا کی ضرورت بری طرح محسوس ہوئی۔ سیاسیات کے باب میں الحاد کی بنیاد پر بننے والے نظریات فاشزم وغیرہ بھی دم توڑ گئے۔

معاشریات یا عمرانیات (Sociology) کے اعتبار سے الحاد اہل مغرب کو سکون فراہم کرنے میں ناکام رہا۔ یہ بے سکونی اس قدر بڑھی کہ وہاں ہپی تحریک نے فروغ پایا جو دنیا کی ذمہ داریوں سے جان چھڑا کر منشیات کے نشے میں مست پڑے رہتے اور سکون کی تلاش میں سرگرداں رہتے حتیٰ کہ بعض تو اسی حالت میں اپنی جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے۔

یہ چند مثالیں ہیں جو بیسویں صدی کی جدید سائنسی تحقیقات کی نتیجے میں الحادی نظریات کی تردید میں آپ کے سامنے پیش کی گئیں۔ ان میں سے اگر صرف کائنات کے توازن اور اس کے عین انسانی ضروریات کے مطابق ہونے ہی کو لیا جائے تو خدا کے وجود کا معاملہ صاف ہو جاتا ہے۔ اس میں بعض چیزیں تو اتنی بدیہی ہیں کہ ان کو جاننے کے لئے کسی سائنسی تحقیق کی ضرورت نہیں بلکہ دیہات میں رہنے والے عام انسان بھی ان کو سوچ اور سمجھ سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں تفصیلی سائنسی دلائل کی بجائے بالعموم ایسی چیزوں سے استدلال کیا گیا ہے جو ہر دور اور ہر ذہنی سطح کے لوگوں کی سمجھ میں آ جائیں۔

دور جدید میں کائنات کا علم یعنی فلکیات ہو یا انسان کی اپنی ذات کا علم یعنی حیاتیات و نفسیات، جیسے جیسے انسان پر حقائق منکشف ہو رہے ہیں، وہ جانتا جا رہا ہے کہ واقعی اس کائنات کا خدا اور اس کا کلام حق ہے۔ سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ (حم سجدہ: 41) "ہم عنقریب انہیں (انسانوں کو) اس کائنات اور اور خود ان کی ذات (جسم و روح) میں اپنی نشانیاں دکھائیں گے یہاں تک کہ ان پر واضح ہو جائے کہ (قرآن) حق ہے۔"

اس موقع پر ہم یہ عرض کرنا مناسب سمجھتے ہیں کہ اثبات خدا سے متعلق سائنسی دلائل دیتے ہوئے ہمیں صرف ان چیزوں سے استدلال کرنا چاہئے جن کی حیثیت سائنس میں حتمی قانون (Law) یا مسلمات کی ہو۔ اگر ہم بھی ملحدین کی طرح محض سائنسی نظریات (Theories) سے استدلال کرنے لگیں گے تو عین ممکن ہے کہ کل وہ نظریات بھی غلط ثابت ہو جائیں اور ہمارا استدلال غلط قرار پائے۔

جاری ہے۔۔۔

محمد ثوبان

اخلاقی میدان

انسان نے جب سے اس روئے زمین پر ایک معاشرے کی شکل میں رہنا شروع کیا تب سے ہی مختلف معاشروں میں مختلف اقدار نے جنم لیا۔ اسی طرح مختلف فنونِ لطیفہ اور کھیلوں کی سرگرمیاں بھی انسانی معاشرے کا جزوِلاینفک رہی ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انسان کے جذبات بھی اِن سے منسلک ہو جاتے ہیں اور یہ چیزیں مختلف قوموں کے رجحانات کی بھی عکاس ہوا کرتی ہیں۔ آج کے جدید معاشرے میں بھی مختلف کھیلوں نے انسانی جذبات کو اپنے ساتھ منسلک کر لیا ہے۔ اس کی عام مثال آپ پاکستانی معاشرے میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔ گزشتہ ماہ ہونے والے ٹی ٹوئنٹی ورلڈ کپ نے انسانی جذبات کی کھیلوں کے ساتھ وابستگی کو مزید نمایاں کیا ہے۔ یہ تو اُن چیزوں کا بیان ہے جو وقت بدلنے کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہیں اور کھیلوں کے میدان بھی تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ کیا کوئی ایسا میدان بھی ہے جہاں ہر انسان کو لڑنا ہے اور وہ کبھی بھی تبدیل نہیں ہوتا؟ اور انسان مسلسل طور پر اِس میدان میں برسرِ پیکار بھی ہے؟؟

جی ہاں قارئین ! ایسا میدان بھی موجود ہے جس پر ابتدائے آفرینش سے ہی انسان لڑتا آیا ہے۔ یہ انسان کا اخلاقی میدان ہے۔ اس میدان کے فاتحین کو دنیا و آخرت میں کامیابی کی نوید سنائی گئی ہے۔ قومِ عاد و ثمود اور قومِ لوط و شعیب اِس بات کا تاریخی ثبوت ہیں کہ اخلاقی میدان کے فاتحین ہی اصل فاتحین ہیں اور اِس میدان میں جو ہار جاتا ہے وہ دنیا و آخرت میں نامراد ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے اسی اخلاقی میدان میں انسان کو آزمائش کے لیے اتارا اور پھر اپنے نبیوں کو مبعوث فرما انسانوں کو کامیابی کا راستہ بھی بتایا۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا (الشمس:9) یقیناً فلاح پا گیا وہ جس نے نفس کا تزکیہ کیا۔

اس آیت میں نفس کا تزکیہ کرنے سے مراد اُن تمام اخلاقیات کو اپنانا ہے جو انسان کے مخلوق ہونے کے ناطے اُس کے نفس میں الہام کر دی گئی ہیں۔ اِن میں سے اولین اخلاقی مطالبہ ایک خدائے بزرگ و برتر کی بندگی ہے۔ اور یقیناً ہر انسان کے لیے صرف یہی کامیابی کا معیار ہے۔

آج کے جدید دور میں ہر انسان اسی اخلاقی میدان میں شیاطین کے مقابلے میں برسرِ پیکار ہے۔ انسان کا اخلاقی وجود اس سے یہ تقاضا کرتا ہے کہ وہ ایک اللہ کو مانے اور اُس کے آخری رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر اپنا آپ اللہ بزرگ و برتر کے سپرد کر دے۔ ہر طرح کا لالچ، بغض، کینہ، ظلم و عدوان، شہوت، خود غرضی، فحاشی عریانی اور تکبر سے اپنے اخلاقی وجود کو پاک کر لے تا کہ بروزِ قیامت اللہ کی بارگاہ میں سرخرو ہو سکے۔

قوموں کے فیصلے تو کھیلوں کے میدان میں نہیں ہوتے مگر انسانوں کے فیصلے اخلاقی میدان میں ضرور ہوتے ہیں اور یہی اخلاقی امتحان سب انسانوں کو پاس کرنا ہے۔

طلحہ خضر

بعثتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا حقیقی مقصد

ہمارے مسلک پرست علماء کی عقابی نگاہیں ضخیم کتبِ رجال سے قدیم راویانِ حدیث کی تاریخ ڈھونڈ نکالنے کا فن خوب جانتی ہیں۔ نیز جرح وتعدیل کی کتابوں سے ائمہ کرام کے اقوال بڑی خوبی سے نقل کرنے سے بھی انجان نہیں۔ مگر پھر نہ جانے ان کی تیر نظر قرآن وسُنت کے اصل جواہرات سے پھسل کیوں جاتی ہے؟ محض فروعی اختلافات کی بناء پر آج مختلف مسالک ایک دوسرے کو ڈھکے چھپے الفاظ میں قرآنی آیات کے ذریعے سبیل المؤمنین سے ہٹا ہوا قرار دیتے ہیں اور کچھ تو دوزخ کی وعید بھی سنا دیتے ہیں۔ اس بات کی شہادت ان کے کتب خانوں میں رکھی تقابلِ مسلک کی کتابیں ہیں جن میں ہمہ روز تحقیقی مقالات اور دوسری طرف کے مخالف مسالک کے نظریات کے رد پر مبنی رسالہ جات نظروں سے گزرتے رہتے ہیں۔

یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ مسلک پرستوں اور اپنی اپنی فقہ پر اصرار کرنے والوں کو آپ کتنا ہی اسلام کے اصل احکامات اور نجات دلانے والے اعمال کی طرف ترغیب دلائیں مگر ان کا ذہن اسلام کے اصلی جوہر کو نظر انداز کر کے چھوٹے چھوٹے مسائل پر اٹک جائے گا اور انہی فروعی مسائل کی تحقیق ان کے پیشِ نظر رہے گی اور انہی کو وہ اصولوں کا درجہ دے کر عوام میں مناظروں اور مجادلوں کا بازار گرم کریں گے۔ ایک عام مسلمان یا نَو مسلم بھی یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ کا دین اتنا مبہم اور غیر واضح تھا کہ ان میں آج بھی محض فروعی مسائل کو اصول بنا کر تحقیقی مقالات پیش کرنے کی گنجائش باقی ہے؟ کبھی آپ نے سوچا کہ نبی ﷺ کی بعثت کا اصل مقصد کیا تھا؟

کیا فروعی و فقہی موشگافیوں کو حل کرنے کے لیے آپ ﷺ کی بعثت ہوئی تھی؟ کیا نماز میں رفع الیدین کرنے یا نہ کرنے کو ثابت کرنا لازم تھا؟ آمین اونچی یا آہستہ کہنے کا فیصلہ ضروری تھا؟ آٹھ یا بیس رکعات تراویح کی تحقیق مقصود تھی؟ فاتحہ خلف الامام کا تصفیہ در پیش تھا؟ ایک یا دونوں ہاتھوں سے سلام کا تعین کرنا تھا؟ بارہ یا آٹھ تکبیراتِ عیدین کا جھگڑا ختم کرانا پیشِ نظر تھا؟ نماز میں ہاتھ ناف یا سینے پر باندھنے کا مسئلہ حل نہیں ہو رہا تھا اسی لیے آپ ﷺ کی آمد ہوئی؟ آیا یہی وہ چیزیں تھی جن کی اصلاح کرنا مقصود تھیں؟ کیا یہی وہ مسائل تھے جن کی بناء پر جنت و جہنم کا اُخروی فیصلہ ہونے والا ہے؟

آج بھی اگر کوئی سُنت کا نام لیتا ہے تو ہمارا ذہن سب سے پہلے اِنہی فروعی مسائل کی طرف منتقل ہوتا ہے اور فقط اِنہی چیزوں کی تحقیق منظورِ نظر ہوتی ہے، اِسی کو ثابت کرنے کے لیے ہمارا سارا وقت صرف ہوتا ہے اور اِسی کے لیے احادیث و فقہ کی کتابوں کو چھانٹا جاتا ہے۔ ہمارا قلب بھی اُس وقت تک مطمئن نہیں ہوتا جب تک اپنے طریقے کو مسنون اور دوسروں کے

طریقے کو اپنے نقطۂ نظر کے مطابق غیر مسنون ثابت نہ کر دیں، چاہے ہماری اپنی زندگی غیر مسنون طریقوں پر ہی کیوں نہ گزر رہی ہو۔ مگر ہمارا ذہن کبھی بھی اُن اعمال و احکام کی طرف نہیں جائے گا جن پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے تصدیقی مہر پہلے سے ہی ثبت ہے۔ جو ابتدائے دنیا سے لے کر اب تک تمام اُمتوں میں مسلمہ تھے اور اِس امت میں بھی انتہائے دنیا تک رہیں گے جن میں کبھی بھی تبدیلی کی گنجائش محسوس نہیں کی گئی۔ لِلّٰہ ایک نظر ذرا قرآن اور مجموعہ ہائے اَحادیث پر ڈالیے اور ایمان داری سے سوچیں کہ کن باتوں کے بجالانے کا ہمیں حکم دیا گیا اور کن باتوں سے اجتناب کرنے کا کہا گیا ہے۔

سچ بولنا، امانت کا پاس رکھنا، وعدہ پورا کرنا، دیانت کا مظاہرہ کرنا، لوگوں سے اچھا سلوک کرنا، صبر و شکر کا رویہ اپنانا، عاجزی و انکساری کو اپنا شعار بنانا، مظلوموں کی مدد کرنا، یتیموں کا خیال رکھنا، بڑوں کا ادب کرنا، ماں باپ کے ساتھ احسان کرنا، رواداری کا پیکر بننا، ، مروت کی بنیاد ڈالنا، ایثار کا جذبہ پروان چڑھانا، عدل و انصاف کا بول بالا کرنا، قناعت کو فروغ دینا، توکل کو ہتھیار بنانا، تواضع سے آشنائی پیدا کرنا، حلم و درگزر کو اپنانا، حیا و عفت کو لازم پکڑنا، اکلِ حلال کو یاد رکھنا وغیرہ۔

کیا یہی اصل سُنتِ نبوی ﷺ نہیں؟ جو تمام مسلمانوں میں تسلیم شدہ ہے جن کو ہم اعتقاداً مانتے تو ہیں مگر عملاً اِن سے کنارہ کش رہتے ہیں؟ کیا اِنہی چیزوں کو دوبارہ زندہ کرنے اور معاشرے میں رواج دینے کے لیے آپ ﷺ کی آمد نہیں ہوئی تھی؟ کیا لوگوں میں اِنہی اچھائیوں کا فقدان نہیں تھا؟

اللہ کے ساتھ شرک کرنا، اس کے احکامات کو جانتے بوجھتے نظر انداز کرنا، حسد کرنا، غرور و تکبر کا اظہار کرنا، غیبت سے لگاؤ رکھنا، بہتان تراشی کا رویہ اپنانا، دھوکا دہی سے کام لینا، گالی گلوچ کو اختیار کرنا، بد اخلاقی کا نمونہ بننا، بغض، کینہ، عداوت، ظلم و جبر، اور جھوٹ سے دامن کو داغدار کرنا، بخل کو شعار بنانا، یتیموں کو دھکے دینا، بیواؤں کو نظر انداز کرنا، مسکینوں کو محروم رکھنا، غریبوں سے نظریں چرانا، بے کسوں کو چھوڑ دینا۔ کیا یہی غیر سبیل المؤمنین نہیں ہے؟ کیا یہی سُنتِ نبوی ﷺ سے منہ موڑنا نہیں ہے؟ کیا یہی منہجِ صحابہ رضی اللہ عنہم سے ہٹنا نہیں ہے؟ کیا یہی سلفِ صالحین کے شعار سے بے وفائی نہیں ہے؟

کیا یہی اعمال معاشرے کے ناسور نہیں تھے جن کو ختم کرنا مقصود تھا؟ کیا یہی عناصر قہرِ الٰہی کا موجب نہیں تھے جن کا خاتمہ از حد ضروری تھا؟ کیا اِنہی ایمانی، اخلاقی و معاشرتی برائیوں کی بیخ کنی پیشِ نظر نہ تھی؟ کیا یہی چیزیں انسانوں کو آپس میں بانٹے ہوئے نہ تھیں؟ کیا یہی رویے پاکیزہ ماحول بننے میں رکاوٹ نہ تھے؟ اگر آپ کا دل مردہ نہ ہو گیا ہو تو وہ ضرور گواہی دے گا کہ یقیناً اِنہی اچھائیوں کو رواج دینے اور اِنہی برائیوں کو ختم کرنے کے لیے آپ ﷺ آئے تھے اور یہی بعثتِ نبوی ﷺ کا حقیقی مقصد تھا، یہی منہجِ صحابہ شعارِ سلفِ صالحین تھا۔

اسی بات کو آخری رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے کہلوایا گیا:

قُلْ هَٰذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللَّهِ عَلَىٰ بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي [يوسف: 108]

میرا راستہ تو یہ ہے، میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں، میں خود بھی پوری روشنی میں اپنا راستہ دیکھ رہا ہوں اور میرے ساتھی بھی۔

اسی راہ کو اختیار کرنے پر انعام یافتہ لوگوں کی رفاقت کی خوشخبری سنائی گئی۔

وَمَنْ يُطِعِ اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَأُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ وَحَسُنَ أُولَٰئِكَ رَفِيقًا [النساء: 69]

جو اللہ اور رسول کی اطاعت کرے گا وہ ان لوگوں کے ساتھ ہو گا جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صالحین کیسے اچھے ہیں یہ رفیق جو کسی کو میسر آئیں۔

اسی طریقِ محمدی ﷺ کو صراط مستقیم کیا گیا ہے۔

وَأَنَّ هَٰذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيمًا فَاتَّبِعُوهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيلِهِ ذَٰلِكُمْ وَصَّاكُمْ بِهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ [الأنعام: 153]

یہی میرا سیدھا راستہ ہے لہٰذا تم اسی پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ اس کے راستے سے ہٹا کر تمہیں پراگندہ کر دیں گے یہ ہے وہ ہدایت جو تمہارے رب نے تمہیں کی ہے، شاید کہ تم کج روی سے بچو۔

اور اگر اسی کی مخالفت کی جائے تو یہ سبیل المومنین کی مخالفت کے مصداق بن جاتا ہے۔

وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّىٰ وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ وَسَاءَتْ مَصِيرًا [النساء: 115]

مگر جو شخص رسول کی مخالفت پر کمربستہ ہو اور اہل ایمان کی روش کے سوا کسی اور روش پر چلے، درآں حالیکہ اس پر راہ راست واضح ہو چکی ہو، تو اُس کو ہم اُسی طرف چلائیں گے جدھر وہ خود پھر گیا اور اسے جہنم میں جھونکیں گے جو بدترین جائے قرار ہے۔

اسی صراط مستقیم اور سبیل المومنین سے ہٹنے کے والوں کی آخرت میں یہ تصویر بنی ہوئی ہو گی۔

وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلَىٰ يَدَيْهِ يَقُولُ يَا لَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُولِ سَبِيلًا ،يَا وَيْلَتَىٰ لَيْتَنِي لَمْ أَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيلًا ،لَقَدْ أَضَلَّنِي عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ إِذْ جَاءَنِي وَكَانَ

ظالم انسان اپنا ہاتھ چبائے گا اور کہے گا "کاش میں نے رسول کا ساتھ دیا ہوتا۔ ہائے میری کم بختی، کاش میں نے فلاں شخص کو دوست نہ بنایا ہوتا۔ اُس کے بہکائے میں آکر میں نے وہ نصیحت نہ مانی جو میرے پاس آئی تھی، شیطان انسان کے حق میں بڑا ہی بے

الشَّیْطَانُ لِلْإِنْسَانِ خَذُولًا [الفرقان: 27 - 29] وفانکلا"۔

یہ حقیقت کوئی ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ جس کو جاننے کے لیے کتابیں کھنگالنی پڑیں، آپ کو اِن باتوں کا تذکرہ قرآن و سُنت میں جگہ جگہ ملے گا۔ اگر ایک انسان بلا امتیازِ مسلک اُن تمام احکامات پر عمل کرتا اور اُن تمام بُرے اعمال سے اجتناب کرتا ہے جن کا ذکر قرآن و سُنت میں آیا ہے تو کیا ایسا شخص صرف اس لیے جہنم میں جھونک دیا جائے گا کہ وہ نماز میں رفع الیدین کرتا یا نہیں کرتا تھا؟ کیا اسی لیے وہ دوزخ کا ایندھن بنے گا کہ وہ آمین جہرًا یا سرًا کا قائل تھا؟ کیا اسی لیے وہ جہنم کا مستحق ٹھہرے گا کہ وہ فاتحہ خلف الامام میں مختلف رائے رکھتا تھا؟ کیا اسی لیے وہ دوزخ کے لائق ہے کہ وہ آٹھ یا بیس رکعاتِ تراویح میں متردد تھا؟ کیا اسی لیے اسے جہنم میں جانا لازم ہے کہ وہ ایک یا دو ہاتھ سے سلام کرنے کا قائل تھا؟ کیا اسی لیے جہنم اس پر واجب ہے کہ وہ نماز میں ہاتھ ناف یا سینے پر رکھتا تھا؟

اِس کے مقابلے میں دوسرے شخص کا تصور ذہن میں لائیں جو اُن محرمات کا ارتکاب کرتا اور اُن فرائض سے جی چراتا ہے جن کا ذکر قرآن و سُنت میں آیا ہے، تو کیا وہ اسی لیے جنت الفردوس کی حور و قصور کا مستحق قرار پائے گا کہ وہ مناظروں میں اِن فروعی مسائل میں اپنے فریق کو پچھاڑ دیا کرتا تھا؟ کیا جنت کے دروازوں پر اس کا استقبال اس لیے ہو گا کہ اس نے رفع الیدین کا محاکمہ کرا دیا تھا؟ کیا جنت کے میوں کا وہ اس لیے حقدار ہو گا کہ اسے سرًا یا جہرًا آمین کے دلائل سے واقفیت حاصل ہو گئی تھی؟ کیا اسی لیے جنت کے غلمان اس کی خدمت کریں گے کہ وہ آٹھ یا بیس رکعات میں تطبیق دینے میں اپنا ثانی نہ رکھتا تھا؟ کیا اسی لیے وہ جنت کے درجات چڑھے گا کہ اس نے نماز میں ہاتھ ناف یا سینے پر باندھنے کی تحقیق کا حق ادا کر دیا تھا؟

اپنے ضمیر سے پوچھیں کیا جنت میں داخلے کا سبب اور جہنم سے چھٹکارے کا انحصار فقط انہی مسائل کی تحقیق و تنقید پر ہے؟ کیا یہی وہ منہجِ صحابہؓ و سلفِ صالحینؒ ہے کہ جن پر اگر ایک انسان عامل ہو تو وارثِ فردوس ورنہ ھاویہ (جہنم کا سب سے نچلا طبقہ) کا سزاوار؟ کیا ایک سلیم العقل شخص اِس بات کو مان سکتا ہے کہ اِن مختلف آراؤں پر مبنی فروعی مسائل ہی دین کا اصل جوہر ہیں اور ایک فریق کی جانب سے ان پر تحقیقی مقالات اور پھر دوسرے فریق کی طرف سے ان کا رَد اسلام میں مقصود ہے؟

یہ سوالات آپ اپنے مسلک پرست علماء سے ضرور پوچھیں!

مجھے تو ہر گروہ کی اپنی اپنی کتابیں پڑھ کر لگتا ہے کہ اب عالم وہی ہے جو اختلافی مسائل پر بحث و مباحثے کا فن جانتا ہو، اب فقیہ اسی کو کہا جائے گا جو قرآن و سُنت سے بعید از عقل قیاس کے جادو سے مسائل کا استنباط کر سکے، اب عابد کہلانے کا حقدار وہی ہے جو کسی مخصوص مسلک کے مطابق نماز پڑھنا جانتا ہو، اب علامہ وہی ہو گا جو اپنے امام کو غیر معصوم ثابت کر سکے،

اب شیخ الاسلام کا مرتبہ اسے حاصل ہو گا جو محض فصاحت و بلاغت و خطابت کا ملکہ رکھتا ہو، اب محدث کا خطاب اسی کو لائق ہے جو احادیث سے اپنے من پسند مؤقف کو تقویت پہنچا سکے، اب مفسر کا سہرا اسی کو سجے گا جو قرآن کی باطل تاویل کرنا بخوبی جانتا ہو، اب خطیب کا لقب اس کے لیے خاص ہے جو عوام میں ایک دوسرے کے خلاف نفرت کا بیج بو سکے۔ ہم اپنی زندگی میں اصل سُنتِ نبوی ﷺ سے چاہے کتنا ہی کوسوں دور ہوں مگر محض مسلکی بنیاد پر مبنی فروعی مسائل کی تحقیق بطورِ سُنت ہی اب ہمارا حقیقی مقصد نظر آتا ہے۔

اگر ان فریقوں نے فروعی مسائل کو اصل سمجھنا نہ چھوڑا تو مجھے یقین ہے کہ یہ مسلکی جنگ اپنی تمام تر شدت کے ساتھ تا قیامت جاری و ساری رہے گی۔

ہمارا ہر عالم فاضل، قرآن مجید کی نظر میں، یہی کہتا نظر آتا ہے کہ:

مَا أُرِيكُمْ إِلَّا مَا أَرَىٰ وَمَا أَهْدِيكُمْ إِلَّا سَبِيلَ الرَّشَادِ (المومن:29) میں تو تم لوگوں کو وہی رائے دے رہا ہوں جو مجھے مناسب نظر آتی ہے اور میں اُسی راستے کی طرف تمہاری رہنمائی کرتا ہوں جو ٹھیک ہے۔

اور جب ایک شخص ان علماء کی مختلف آراؤں پر نظر ڈالتا ہے تو بے اختیار پکار اٹھتا ہے کہ:

فَهَلْ إِلَىٰ خُرُوجٍ مِّن سَبِيلٍ (المومن:11) کیا اب یہاں سے نکلنے کی بھی کوئی سبیل ہے؟

آخر کار جب ایسا شخص ان کا کوئی حل نہیں پاتا تو تھک ہار کر اپنا حتمی فیصلہ سنا دیتا ہے کہ:

كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ، فَذَرْهُمْ فِي غَمْرَتِهِمْ حَتَّىٰ حِينٍ (المومنون:53-54) ہر گروہ کے پاس جو کچھ ہے اُسی میں وہ مگن ہے اچھا، تو چھوڑو انہیں، ڈوبے رہیں اپنی غفلت میں ایک وقت خاص تک۔

صاحبو! یہ مضمون اس لیے لکھا گیا ہے کہ ہم بتا سکیں کہ قرآن و سُنت لوگوں سے کس طرزِ عمل کا مطالبہ کرتے ہیں اور ہم ان سے کیا اَخذ کر رہے ہیں؟ لہٰذا مسلمانوں کی یہ حالت دیکھ کر بقول سیدنا مسیح علیہ السلام میں اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ہم مچھر چھان رہے ہیں اور بڑے بڑے اونٹ بڑی بے تکلفی سے نگل رہے ہیں۔

اگر روزِ قیامت اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ سے ان کی اُمت کی گمراہی کا سبب پوچھ لیا تو زبانِ محمد ﷺ بھی یہ کہہ کر بَری الذمہ ہو جائے گی-:

يَا رَبِّ إِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوا هَٰذَا الْقُرْآنَ مَهْجُورًا اے پروردگار میری قوم نے اِس قرآن کو چھوڑ رکھا تھا۔

(الفرقان:۳۰)

ڈاکٹر ظہور احمد دانش

فن تحقیق اور تحقیق کے طریقے (پارٹ 3)

مسودہ کی ترتیب و تدوین

جب اس امر کا یقین ہو جائے کہ بقدر کفایت معلومات کا ذخیرہ جمع ہو چکا ہے تو مسودہ لکھنا شروع کر دینا چاہیئے۔ لکھتے وقت اس ترتیب کا خیال رکھا جائے کہ مرکزی عنوانات کے تحت ذیلی عنوانات قائم کئے جائیں۔

دوران تحقیق کی باریکیاں

(1) خلاصہ کا طریقہ:

کسی بھی موضوع کی تلخیص یا اختصار مؤلف کی مراد کو اچھی طرح سمجھ کر کرنا چاہیئے۔ خلاصہ کا اصل متن سے تقابل کر کے معانی اور فکر کی باہم مطابقت کو یقینی بنانا اہمیت کا حامل ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ مولف یا مصنف کی معلومات کا تقاضا کچھ تھا۔ راقم اپنے تفردات پیش کرنے کی کوشش میں اصل عنوان سے ہی ہٹ جائے تو یہ سراسر تحقیق کے خلاف ہے۔

(2) مقدمہ

تحقیق کا اجمالی خاکہ مقدمہ کہلاتا ہے لہذا ضروری ہے کہ مقدمہ ایسی جامع عبارت اور دلآویز اسلوب میں لکھا جائے کہ جو قاری کو پوری طرح اپنی گرفت میں رکھے اور اسے پیش کردہ تحریری مواد پڑھنے پر آمادہ کر دے۔ پہلے مقدمہ تحریر کیا جائے۔ جس کے مطابق تحقیق نگار اپنی تحقیق کو خاص نہج کی طرف موڑنا چاہتا ہے۔

(3) خلاصۂ تحقیق

خلاصہ افکار و نظریات کا نچوڑ اور ان نتائج کا بیان ہوتا ہے جن تک محقق نے رسائی حاصل کی ہوتی ہے۔ لہذا ہر باب کے اختتام پر اہم معلومات کا خلاصۃً جائزہ پیش کیا جائے۔ تا کہ قاری کو پیش کردہ معلومات مختصر وقت میں میسر آسکے۔

(4) ضمائر متکلم سے گریز

ایسی عبارت سے اجتناب کیا جائے جن سے اپنی ذات کے اظہار کا تاثر ملے ایسے جملے جیسے میرا یہ نظریہ ہے میں اس نتیجے پر پہنچا سے بچا جائے۔

(5) کروفر، شان و شوکت بیان کرنے سے اجتناب

ایسے کام سے بچا جائے جس سے اپنے عمل، ذات، محنت اور تحقیق کی راہ میں مشکلات کے بارے میں مبالغہ آرائی کا تاثر ہو بلکہ یوں بیان کیا جائے مجھ پر یہ بات ظاہر ہوئی یا پہلے جو کچھ ذکر ہو چکا اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے۔ اپنی شان و شوکت بیان کرنا مناسب نہیں۔

(6) فنی اصطلاحات کا استعمال

فنی اصطلاحات سے تحقیق میں قوت اور جان پیدا ہوتی ہے۔ ان کا موقع و محل سے استعمال عبارت کے حسن کو دوبالا کرتا ہے۔ تحقیق کو فصیح زبان میں املاء و لغت کے قواعد کی رعایت کے ساتھ ضبط تحریر میں لایا جائے۔

(7) ذاتی رائے میں پختگی

تحریر میں اپنی رائے پر کہیں بھی تذبذب اور بے یقینی کی کیفیت ظاہر نہ ہونے پائے۔ آئیں بائیں شائیں کی تحقیق میں بالکل بھی گنجائش نہیں ہوتی۔ جو بھی مؤقف ہو اس میں پختگی ہو۔ ضعیف شکوک و شبہات کو جنم دینے والی عبارات و معلومات سے اعراض کیا جائے۔

(8) طوالت سے پرہیز

فن فصاحت و بلاغت میں طویل اور غرابت والے کلام کو فن کے خلاف جانا جاتا ہے۔ عبارت میں کفایت لفظی فصاحت و بلاغت کی روح ہے۔ اگر کوئی مفہوم پانچ الفاظ میں بیان ہو سکے تو اسے چھ یا اس سے زائد میں بیان کرنے سے پرہیز کیا جائے۔ فعل، فاعل، مبتدا، شرط، جزاء میں طویل فاصلے سے احتراز کیا جائے۔

(9) دلائل کی ترتیب

کسی رائے کی تائید میں استدلال کا آغاز نسبتاً کمزور دلائل سے بتدریج قوی کی طرف بڑھنا چاہیے۔

(10) نقل کو اصل کی طرف منسوب کرنے سے گریز

ایسے ماخذ سے استدلال جو خود کسی دوسرے ماخذ سے نقل کیا گیا ہو، اسے اصل ماخذ کی طرف منسوب نہیں کرنا چاہیے۔ اگر اصل ماخذ تک رسائی ممکن نہ ہو تو اقتباس کردہ عبارت کو علامات تحدید کے درمیان قوسین میں لکھ دیا جائے، جیسے :(فلاں مؤلف نے اپنی فلاں کتاب کے فلاں صفحہ پر یہ اقتباس نقل کیا ہے۔)

(11) عبارات میں باہم ربط

جس چیز کا اقتباس مکمل نقل ہو چکا ہو، اس کے درمیان اور اسکے اگلے پچھلے اجزاء کے درمیان ربط کو ملحوظ رکھا جانا چاہیے۔ لہٰذا بہتر ہو گا کہ ایک تمہید باندھ کر اقتباس کردہ افکار کا موضوع سے ربط اور اس کی اہمیت بیان کر دی جائے۔ تسلسل ہی میں کلام کا حسن اور فن کی مہارت ہے اس کا ضرور خیال رکھیں۔ یہ بہت ضروری ہے۔

(12) مواد نقل کرنے میں احتیاط

اقتباس کا متن نقل کرنے میں نہایت احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ ایک ایک لفظ کو بغیر کسی ترمیم کے نقل کیا جائے۔ اگر اقتباس میں کسی قسم کی غلطی ہو تو قاری کو لکھ کر آگاہ کیا جائے کہ یہ غلطی اصل کتاب کی ہے اور اس کے بعد قوسین میں لکھ دے (اصل کتاب میں اس طرح ہے)۔

(13) علمی القاب و خطابات سے اجتناب

تحقیق میں شخصیات کا حوالہ دیتے ہوئے بہتر ہے کہ ان کے علمی القاب اور عہدے و خطابات کا ذکر نہ کیا جائے سوائے اس کے کہ موقع کی مناسبت سے اس کی ضرورت ہو۔

جاری ہے۔۔۔

قَالَ النَّبِیُّ ﷺ

عَنْ أَنَسٍ عَنْ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يَسِّرُوا وَلَا تُعَسِّرُوا وَبَشِّرُوا وَلَا تُنَفِّرُوا

انس رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا (دین میں) آسانی کرو اور سختی نہ کرو، لوگوں کو خوشخبری سناؤ اور (زیادہ ترڈرا کر انہیں دین سے) متنفر نہ کرو۔ (صحیح بخاری، حدیث 69)

ڈاکٹر ظہور احمد دانش

ہمارے حواسِ خمسہ اور اس کا فنکشنل سسٹم

ہمارا جسم قدرت کا انمول تحفہ ہے۔فطرت نے اس میں نہ جانے کیسے کیسے راز رکھے ہیں۔جیسے جیسے علم الابدان کی گرہ کھلتی جارہی ہے۔ نئی سے نئی معلومات سامنے آتی چلی جارہی ہے۔اس مضمون میں بھی ہم آپ تک معقول اور مفید معلومات پہنچانے کی کوشش کریں گے۔

ایک شخص کے پاس پانچ اہم حواس ہوتے ہیں، جو پانچ ٹولز کی نمائندگی کرتے ہیں جو اسے اپنے ارد گرد کی دنیا کو دریافت کرنے میں مدد دیتے ہیں، اور ان میں درج ذیل حواس شامل ہیں: لمس کی حس، ذائقہ کا احساس، سننے کی حس، سونگھنے کی حس، اور حس نظر شامل ہے۔آیئے ذرا ایک ایک حس کے بارے میں جانتے ہیں۔

نظر کی حس:

نظر کی حس (انگریزی میں:Sense of Sight) وہ حس ہے جو بصارت میں مدد کرتی ہے۔جہاں آنکھ روشنی پر عمل کرتی ہے اور اسے دماغ تک پہنچاتی ہے، جو اس کی تشریح کرتی ہے، اور روشنی آنکھ کے کارنیا سے گزرتی ہے۔جو آنکھ میں داخل ہونے والی روشنی کے حجم کو منظم کرنے میں کردار ادا کرتا ہے اور آنکھ کے رنگین حصے کو آئیرس کہا جاتا ہے، اور آنکھ میں روشنی کا فوکس اس کے ایک حصے پر منحصر ہوتا ہے جسے ریٹینا کہا جاتا ہے، جو اس روشنی کو آنکھ میں تبدیل کرنے میں مدد کرتا ہے۔ اعصاب اور یہ دماغ میں اس کی منتقلی کی طرف جاتا ہے، جو اس کی تشریح میں دلچسپی رکھتا ہے۔

انسانی آنکھ 10،9 ڈگری پر کمزور روشنی میں دیکھنے کی صلاحیت سے خصوصیت رکھتی ہے۔انسانی آنکھ اعصاب کے 10 بلین نیٹ ورکس کے ذریعے دماغ کو اپنا ڈیٹا بھیجتی ہے، یہ سب آنکھ کے ڈیٹا کے خصوصی پروسیسر کی تشکیل کرتے ہیں۔

سننے کا احساس:

قارئین: سننے کی صلاحیت اللہ کا انعام ہے۔اس کی قدر اس سے پوچھیں جس کے پاس یہ نعمت نہیں۔ہر شخص کے سر کے دونوں طرف کان ہوتے ہیں اور کان کے اجزاء کھوپڑی سے جڑے ہوتے ہیں اور انسانی کان کے تین اہم حصے ہوتے ہیں:

بیرونی کان

اس میں دو حصے شامل ہیں، پنا اور سمعی نہر، جو کان کے کھلنے کی نمائندگی کرتی ہے جسے انسان اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ یہ کان کے پردے کا راستہ ہے۔ بال کان کی بیرونی جلد اور اس کے اندرونی غدود کو ڈھانپتے ہیں۔ ایک پیلے رنگ کا مادہ خارج کرتا ہے جس کو رال والی نوعیت کا earwax کہتے ہیں۔ یہ ڈرم کو اس میں پھنسی ہوئی گندگی سے ضروری تحفظ فراہم کرتا ہے۔

درمیانی کان

اس میں سمعی صلاحیت شامل ہوتی ہے۔ جو ایک دوسرے کے ساتھ بات چیت کرتے ہیں۔

اندرونی کان

اس میں گھونگھے کے خول کی طرح ایک خول ہوتا ہے۔ انسانی جسم میں سماعت کا عمل دماغ تک اعصابی سگنل کی ترسیل اور ترسیل میں کان کے کردار پر منحصر ہے۔ کان جسم کے توازن کو برقرار رکھنے، اور اسے صحیح طریقے سے حرکت کرنے میں مدد فراہم کرتا ہے۔

سونگھنے کی حس (انگریزی: Sense of Smell)

ہوا میں گردش کرنے والی بدبو کو الگ کرنے کا احساس ہے جہاں انسانی دماغ بڑی تعداد میں بدبو کو الگ کرتا ہے اور سونگھنے کا عمل ناک میں اشیاء کو براہ راست داخل کر کے کیا جاتا ہے۔ یا منہ کے ذریعے اور پھر ناک کے ذریعے۔ ایک طرف باہر کی دنیا اور دوسری طرف معلومات کا ترجمہ کرنے کے لیے سگنل دماغ تک پہنچتے ہیں اور سونگھنے کا عمل ہوتا ہے۔

ذائقہ کی حس (انگریزی: Sense of Taste)

ایک احساس ہے جو انسانی زبان پر خلیوں کے ایک گروپ کے پھیلاؤ پر منحصر ہے۔ انسان کو کھانے کو چکھنے اور مائعات کا ذائقہ جاننے میں مدد کرتا ہے، اور میٹھے، کڑوے اور نمکین میں فرق کرنا، اور یہ خلیے پوری زبان میں پھیل جاتے ہیں۔ جہاں پیش منظر میں میٹھے کھانے کو چکھنے کے ذمہ دار خلیات ہیں، اور نیچے کڑوے کھانے میں مہارت رکھنے والے خلیے ہیں، اور دونوں طرف نمکین اور کھٹے کھانے کے تعین میں مہارت رکھنے والے خلیے ہیں۔ چھو کر محسوس کرنا قدرت کی عظیم تحفہ ہے۔

لمس کی حس چھونے کی حس (انگریزی میں: Sense of Touch)

وہ احساس ہے جو بنیادی طور پر انسانی جلد پر منحصر ہے اور یہ احساس انسان کو چیزوں کی نوعیت جاننے میں مدد کرتا ہے جب وہ ان کو چھوتا ہے۔ جو ان کی شناخت کرنے کی اس کی صلاحیت کو سہارا دیتا ہے، اس لیے وہ ان کی سختی کی حد کا تعین کر سکتا ہے، اور ٹھنڈا ہو یا گرم، ٹھنڈی چیزوں کے نتیجے میں گرمی کو محسوس کر سکتا ہے، اس لیے جلد کو انسانی جسم کا پہلا عضو سمجھا جاتا ہے جس سے سب متاثر ہوتے ہیں۔

چھونے کے احساس کے لیے ذمہ دار خلیے پوری انسانی جلد میں پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ صرف جلد پر ایک جگہ جمع نہیں ہوتا، بلکہ جلد کی سطح کے علاقوں پر بے قاعدہ طور پر تقسیم ہوتا ہے، اور جتنی زیادہ نیورانز کی تعداد کسی خطے میں زیادہ ہوتی ہے، انسانی رابطے کی حس اتنی ہی زیادہ ہوتی ہے۔ زبان کے سامنے والے حصے کو جسم کا سب سے زیادہ چھونے والا حصہ سمجھا جاتا ہے جب کہ جسم کے سب سے کمزور حصوں کو چھونے کا احساس ہوتا ہے۔ لمس ہاتھ کی ہتھیلی کا پچھلا حصہ اور ناک کی نوک اور انگلیوں کی نوک ہے۔ رابطے کے انتہائی حساس حصے ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اپنی امت کے بارے میں تشویش

قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: إِنَّ مَا أَتَخَوَّفُ عَلَيْكُمْ رَجُلٌ قَرَأَ الْقُرْآنَ حَتَّى إِذَا رُئِيَتْ بَهْجَتُهُ عَلَيْهِ، وَكَانَ رِدْئًا لِلْإِسْلَامِ، غَيَّرَهُ إِلَى مَا شَاءَ اللهُ، فَانْسَلَخَ مِنْهُ وَنَبَذَهُ وَرَاءَ ظَهْرِهِ، وَسَعَى عَلَى جَارِهِ بِالسَّيْفِ، وَرَمَاهُ بِالشِّرْكِ، قَالَ: قُلْتُ: يَا نَبِيَّ اللهِ، أَيُّهُمَا أَوْلَى بِالشِّرْكِ، الْمَرْمِيُّ أَمِ الرَّامِي؟ قَالَ: بَلِ الرَّامِي۔ صحیح ابن حبان - کتاب العلم - ذکر ما کان یتخوف صلی اللہ علیہ وسلم علی أمتہ جدال المنافق، رقم الحدیث 81

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مجھے جو تمہارے بارے میں سب سے زیادہ خوف یہ ہے کہ: کوئی شخص جس نے قرآن پڑھا ہو گا، یہاں تک کہ اس پر اس کا نور نظر آنے لگا، جبکہ وہ شخص (حقیقت میں) اسلام کے لئے برا تھا، تو اللہ نے اسے اپنی مرضی سے جس طرف چاہا موڑ دیا۔ پس وہ اس (قرآن) کی پابندی سے نکل گیا اور اسے اپنی پیٹھ پیچھے ڈال لیا اور تلوار لے کر اپنے ہمسائے پر چڑھ دوڑا اور اس پر شرک کا الزام لگانے لگا۔ کہا میں نے پوچھا: اے اللہ کے نبی ﷺ، ان دونوں میں سے شرک کے قریب کون ہو گا؟ جس پر الزام لگایا گیا ہے وہ یا الزام لگانے والا خود؟ فرمایا: بلکہ الزام لگانے والا۔

عبد الباسط

جدید نظریہ اجتہاد

آج ہم "اجتہاد" کے اس نئے نظریے پر بات کریں گے جو غیر اسلامی ہونے کے ساتھ ساتھ کئی ایک غلط فہمیوں کا سبب ہے۔ اجتہاد چونکہ ایک فکری و ذہنی کاوش ہے اس لیے ہر غلط اور صحیح سمت میں یکساں استعمال پر منطبق کرنے کی کاوش کو اجتہاد سے تعبیر کیا جانے لگا ہے۔ چونکہ ذہنی و فکری سمت ہر فرد (قطع نظر اس کے کہ وہ فاضل ہے یا جاہل) رکھتا ہے اس لیے یہ حیثیت ہر فرد اپنی جگہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔

اجتہاد کا دروازہ بند ہونے کا مفہوم اگر اس تناظر میں دیکھا جائے تو بالکل سمجھ میں آتا ہے کہ ایسی کسی پریکٹس کی اسلام میں ہرگز اجازت نہیں ہے۔ اگر اس کا مفہوم علمی و فکری کاوش ہو تو اہل علم و عمل طبقہ آج بھی اس درجہ پر فائز ہو سکتا ہے بلکہ امت میں جید علماء اس درجے پر فائز ہیں۔

اجتہاد کا جو مفہوم مغربی علماء اور ہمارے معاشرے کے سہل پسند و نفس پرست افراد سمجھتے ہیں اور قانون اسلامی اپنی خواہش نفس سے مرتب کرنا چاہتے ہیں ان کے نزدیک سہل پسندی، نفس پرستی اور گناہ کے جواز کی نئی صورتیں اخذ کرنا نیز قانون اسلامی کے نفاذ کی بجائے قانون میں تغیر و تبدل، تاویل و تردید کی راہیں تلاش کرنا ہے۔ اور پھر انہی کو اسلام سمجھنا، ان پر علماء کے نقد کو اجتہاد پر نقد سمجھنا اور بے جا من مانی تشریحات بیان کر کے انتشار امت کا سبب بننا ہے۔

مجھے عملی طور پر اس بات کا ادراک ہوا ہے کہ عصر حاضر میں کسی مسئلے کے واضح و دوٹوک شرعی حل سے بچنے کے لیے ہم (بعض قانون ساز افراد) خود ساختہ تاویلات و تشریحات سے مسئلہ کی نوعیت بالکل بدل دیتے ہیں اور حقائق قطعی طور پر روپوش ہو جاتے ہیں۔ افسوس ایسی صورت میں نتیجہ کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے اور اس قسم کی اجتہادی کاوش ہر خاص و عام کر رہا ہے اگرچہ بعض اہل علم میری اس رائے سے اتفاق نہ کریں تاہم حقیقت حال یہی ہے اور شاید وہ اس تجربہ سے نہیں گزرے جس کے سبب اختلاف رائے رکھنے کے مجاز ہیں۔

ہمارے ہاں پولیس، تھانہ، کچہری اور عدالت یہ اہم ادارے ہیں۔ یہ اجتہادی مرکز نہیں ہیں اگرچہ انہیں بنانے کی ضرورت ہے مگر افسوس مجھے دور تک ایسی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ ایک اور تکلیف دہ بات یہ بھی ہے کہ مستشرقین اسلامی

قانون کو سمجھنے کے لیے انہی اداروں کا رخ کرتے ہیں۔ پھر علماء و اداروں کے مابین تصادم کو اسلامی قانون کے نا قابل عمل ہونے پر قیاس کر لیتے ہیں۔

یہاں کئی ایک ایسی چیزیں موجود ہیں جن کا اجتہاد سے تعلق ہی نہیں ہے بلکہ حالات و واقعات کی صحیح تحقیق سے ان مسائل کا حل میسر آتا ہے مگر ہم یہاں اجتہاد کا مطالبہ یا غیر اسلامی انطباق کر کے شرع کا مذاق اڑاتے ہیں اس جرم کی سزا اللہ تعالیٰ نے ما قبل اقوام بالخصوص بنی اسرائیل کو دی اور ہمیں بھی مل رہی ہے کہ معاشرے میں انتشار وانار کی، افراتفری و تصادم بڑھ رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں صحیح معنوں میں فہم دین عطا فرمائے اور اس پر عمل کی توفیق دے۔ ہماری کوتاہیوں سے در گزر فرمائے اور ہمیں رجوع الی اللہ کی سعادت عطا فرمائے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خُلقِ عظیم

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِنَ اللَّهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ

یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم ان کے لیے نرم ہو، اگر تم تند خو اور سخت دل ہوتے تو یہ لوگ تمہارے پاس سے بھاگ جاتے۔ پس ان کو معاف کر دو اور ان کے لیے مغفرت مانگو اور معاملات میں ان سے مشورہ لو۔ پھر جب فیصلہ کر لو تو اللہ پر بھروسہ کرو۔ بیشک اللہ ان سے محبت کرتا ہے جو اس پر بھروسہ رکھتے ہیں۔[آل عمران: 159]

محمد رضوان

حلال اور حرام

عبد اللہ کا فنانس اور اکاؤنٹنگ کا پیپر تھا اور عبد اللہ پیپر کی تیاری کر رہا تھا۔ عبد اللہ ویسے تو پیپر سے ایک دو دن پہلے ہی تیاری کر تا تھا۔ عبد اللہ چند گنے چنے سوالوں کی ہی تیاری کر رہا تھا تا کہ کم وقت میں زیادہ تیاری کر سکے وہ سوال حل کر ہی رہا تھا کہ اس نے ایک بات نوٹ کی کہ یہ ساری کی ساری فنانس صرف ایک فیکٹر کے گرد گھومتی ہے اور وہ ہے سود (انٹرسٹ)۔ ساری کی ساری فنانس اس سود پر منحصر ہے سارے فارمولوں میں سے صرف یہ انٹرسٹ کا فیکٹر نکال دو تو یہ کیپیٹل ازم کی ساری عمارت دھڑام سے گر پڑے گی، کیسی بوسیدہ عمارت ہے یہ۔ قرآن میں اللہ فرماتا ہے کہ مکڑی بھی گھر بناتی ہے اور سب سے بوسیدہ اور کمزور گھر مکڑی کا ہے۔ اگر غور کریں تو مکڑی کا گھر واقعی اتنے باریک دھاگہ نما مواد سے بنا ہوتا ہے کہ اس کو تھوڑا سا چھوئیں بھی تو وہ ٹوٹ جاتا ہے۔ لیکن اگر اتنی ہی باریک تاریں تانبے سے بھی بنائی جائیں اور ان سے اس طرح کا جال یا گھر بنانے کی کوشش کریں تو وہ نہیں رہ سکے گا وہ اس سے بھی کمزور ہو گا۔ یہی حال کچھ اس کیپیٹل ازم (سرمایہ دارانہ نظام) کے گھر کا ہے اگر اس میں سے سود کو نکال دیں تو یہ عمدہ تیار کردہ عمارت بالکل بوسیدہ لگنے لگتی ہے۔ عبد اللہ حسب عادت پھر بھول چکا تھا کہ وہ کیا کر رہا تھا وہ یہ بھول گیا کہ وقت کم ہے اور وہ امتحان کی تیاری کر رہا تھا۔ اس نے نظاموں کی مماثلت کرنا شروع کر دی۔ اس نے بارٹر نظام (لین دین) کا اس کیپیٹلسٹ نظام سے موازنہ شروع کر دیا۔

وہ چند گھنٹوں کے غور و خوض کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ بارٹر اور کیپیٹلسٹک (سرمایہ دارانہ) نظام میں کوئی فرق نہیں ہے، لیکن اگر دیکھا جائے تو بہت فرق پڑ جاتا ہے۔ اس نے سوچنا شروع کر دیا کہ اگر اسلامی نقطہ نگاہ سے دیکھا جائے تو بہت ہی زیادہ فرق ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ لوگ حلال کو حرام کر لیتے ہیں۔ وہ سوچنے لگا کہ حلال کو حرام کر لیتے ہیں جبکہ ویلیو اور قدر میں کوئی فرق نہیں پڑ رہا۔

اس کا دماغ بالکل اسی ایک نکتہ پر آ کر منجمد ہو گیا اور پھر اس نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ سوچے اور جانے کہ آخر حلال کیا ہے اور حرام کیا ہے۔ پھر اس نے دینی نکتہ نظر سے بھی دیکھنا شروع کیا تو اسے صرف ایک بات سمجھ آئی کہ جس کام کے کرنے کا حکم دیا گیا ہے وہ حلال ہے اور جس سے منع کیا گیا ہے وہ حرام ہے۔ اسی طرح جس طرح کچھ چیزیں کھانے کو حلال اور کچھ کو نہ کھانے کا کہا گیا ہے انکا کھانا حرام ہے۔ اس نے غور کرنا شروع کیا کہ جن کہ بارے میں کچھ نہیں کہا گیا تو وہ کیا ہیں؟ وہ اسی سوال کی مزید کھوج میں لگ گیا تو اسے یہ حدیث ملی۔ "حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے، حلال و حرام کے درمیان کچھ مشتبہات ہیں جنہیں اکثر لوگ نہیں جانتے، پس جو شخص شبہ میں ڈالنے والی چیز سے بچا، اپنے آپ کو محفوظ رکھا، اس نے اپنے دین اور عزت کو محفوظ کر لیا اور جو شبہ ڈالنے والی چیزوں میں پڑ گیا تو وہ حرام میں پڑ گیا"۔

عبد اللہ پھر مبہوت ہو کر رہ گیا کہ یہ تو بڑی واضح اور لاجیکل سی بات ہے۔ اس کا سر گھومنے لگا کہ آخر حلال اور حرام کے پیچھے کیا حکمت ہے، اسے جب احساس ہوا کہ وہ تو امتحان کی تیاری کر رہا تھا، کن چکروں میں پڑ گیا ہے تو اس نے اپنے سر کو جھٹکا اور خود کو بظاہر تسلی دینے کی کوشش کی کہ یہ اس کا کام نہیں ہے اس بحث کو علماء پر چھوڑو اور جو اس کا کام ہے وہ کرے۔ لیکن دل کو تسلی کہاں تھی پھر اس نے ایک نکتہ نکالا کہ حلال اور حرام میں ایک سادہ سا فرق یہ ہے کہ عمل کا طرز عمل کیا ہے، یہ اہم ہے عمل اہم نہیں ہے طرز عمل اہم ہے کہ اس کو کس طرح سے انجام دیا جاتا ہے اسی طرح جس طرح کوئی برا کام بھی اچھی نیت سے کرے تو وہ برا ہی ہے۔ اب اس نے اپنے اس نتیجے کیلئے دلیلیں گھڑنا شروع کر دیں تاکہ دل کو تسلی دے سکے کہ جس طرح انگور سے سرکہ بھی بنتا ہے اور شراب بھی۔ دونوں کو انگور سے ہی حاصل کیا جاتا ہے لیکن ایک حرام ہے اور دوسرا حلال۔ لیکن اللہ نے اسی شراب کا آخرت میں وعدہ کیا ہے اور اس دنیا میں منع کیا ہے۔ لہذا اب عبد اللہ کو ایک فرق واضح طور پر نظر آیا کہ حلال اور حرام میں جو فرق ہے وہ حدود و قیود کا ہے۔ اسلام نے کچھ حدود مقرر کر دی ہیں جن کے اندر رہ کر کام کرنا حلال اور ان سے تجاوز کرنا حرام ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہے تو اللہ خود بتا دیتا ہے کہ ہم نے انسان کو پیدا کیا اور اسے راہ بھی بتائی چاہے تو مانے اور چاہے تو نہ مانے۔ ماننے والوں کیلیے بشارتیں اور نہ ماننے والوں کیلیے وعید بھی سنا دی ہے۔

اب دوبارہ آتے ہیں اس بات کی طرف کہ وہ لوگ کس طرح حلال کو حرام کر لیتے ہیں اور ویلیو یا قدر میں کوئی فرق نہیں پڑتا، اس کو ایک مثال کے ذریعے سمجھتے ہیں۔ فرض کریں کہ میں کسی سے ایک لاکھ ادھار لیتا ہوں اور ادھار دینے والے کا تقاضا ہے کہ وہ اس پر دس فیصد کے حساب سے سود لے گا اور طے یہ پاتا ہے کہ ہر مہینہ ۵ ہزار کی قسط کی صورت میں لوٹا دوں گا تو جب وہ دو سال میں رقم لوٹائے گا تو اصل میں جو ایک لاکھ لوٹایا وہ تو لوٹایا ہی سود کی مد میں کم از کم ایک لاکھ سے زائد ساتھ میں ادا کر چکا ہو گا۔ تقریباً دوگنے سے زیادہ واپس کر چکا ہو گا۔ اب عقل کے مطابق سوچیں تو قرض تو وہی لیتا ہے جس کو ضرورت ہو اور اس سے دوگنا واپس وصول کرنا استحصال نہیں تو پھر اور کیا ہے؟ اب دوسری طرف بارٹر سسٹم کے مطابق دیکھتے ہیں۔ فرض کریں میں کسی شخص سے گندم ادھار لیتا ہوں اور طے یہ پاتا ہے کہ اس گندم کے بدلے گندم ہی دو سال بعد لوٹا دوں گا پچاس من گندم ادھار لیتا ہوں آج اگر اس گندم کی قیمت دو ہزار فی من ہے تو دو سال بعد اس کی قیمت بڑھے گی بھی اور اگر کسی ملک کی اکانومی بد سے بدتر بھی ہو جائے تو زیادہ سے زیادہ دو سال میں قیمت تین گناہ ہو جائے گی اور گندم تین سال بعد واپس کرنا کوئی تین گناہ مہنگا پڑ جائے گا۔ اب سود والی مثال میں بھی یہی ہوا کے وقت کے ساتھ ساتھ ادھار زیادہ ادا کرنا پڑا اور گندم والی مثال میں بھی۔ لیکن پہلا معاملہ حرام ہے اور دوسرا حلال۔ لہذا عمل معنی نہیں رکھتا نیت اور طرز عمل اہمیت رکھتا ہے اور یہ ظاہر کرتا ہے کہ اللہ ہماری ترجیح میں کہاں ہے۔

شاہ فیصل ناصر

سفر نامۂ حج 1440ھ (قسط سوم)

حج سے قبل بائیو میٹرک

امسال سعودی حکام نے تمام حجاج کیلئے بائیو میٹرک یعنی انگوٹھے لگانا لازمی قرار دیا تھا، جو اعتماد نامی کمپنی کی ذریعے کیا جارہا تھا۔ ہمیں اعتماد سنٹر مردان میں 27 اپریل کو 4 بجے کا ٹائم دیا گیا تھا۔ مقررہ تاریخ اور وقت پر بائیو میٹرک کیا اور عید الفطر کے بعد پاسپورٹ متعلقہ بینک میں جمع کروایا۔ جو ویزا لگانے کیلئے سفارت خانے کو بھیجا جاتا ہے۔

وزارت مذھبی امور نے ضلع باجوڑ کے حجاج کرام کیلئے 18 جون کو گورنمنٹ ہائی سکول خار میں ایک بڑے تربیتی پروگرام کا انعقاد کیا تھا، جس میں طریقہ حج وعمرہ اور سفر کی ھدایات علماء کرام نے تفصیل سے بیان کیں۔ ایسے عملی تربیتی پروگراموں میں شرکت سے حجاج کو سفر میں بہت آسانی ہوتی ہے اور احکام صحیح طریقے سے ادا کرسکتے ہیں۔

حج اکثر عمر بھر میں ایک ہی مرتبہ ہوتا ہے اور ایک نئی سرزمین میں ایسے احکامات کی تعمیل کرتے ہوئے انجام دینا ہوتا ہے جن سے حاجی پہلی دفعہ متعارف ہوا ہوتا ہے۔ اس لئے حج وعمرہ کیلئے جانے سے قبل اس کا مکمل مسنون طریقہ یاد کرنا چاہیے تاکہ مناسک واحکام کو سنت کے مطابق ادا کیا جائے اور انسان کی کوششیں، تکالیف اور جانی ومالی قربانی رائیگاں نہ ہو جائیں۔ اس کے ساتھ انتظامی ھدایات پر بھی عمل کرنا چاہیے تاکہ نہ حاجی کو خود پریشانی ہو اور نہ وہ کسی اور کیلئے پریشانی کا سبب بنے۔

22 جون کو وزارتِ مذہبی امور کی طرف سے فلائیٹ شیڈول ملا۔ جس کے ملتے ہی ہم نے سفر کیلئے اشیائے ضروریہ کا بندوبست شروع کیا۔ گذشتہ سالوں حج ادا کرنے والوں سے معلومات حاصل کی، کہ وہاں کیا کیا چیز لے جانا چاہیے۔ کچھ ان کے مشوروں کی روشنی میں اور کچھ اپنی سوچ بچار کرکے سامان کی لکھی ہوئی لسٹ بنائی، تاکہ خریداری کی وقت کوئی چیز ذھن سے نکل کر رہ نہ جائے۔ ضرورت کی چیزیں ہر جگہ ملتی ہیں لیکن جن پیسوں سے آپ کو یہاں اعلی چیز ملتی ہے وہاں کمزور ترین بھی نہیں ملتی۔ اس لئے کوشش کرنی چاہیے کہ ضرورت کا سامان پاکستان ہی سے لے جایا جائے۔ غیر ضروری سامان لینے سے گریز کیا جائے۔ ضروری سامان میں ایک بڑا بیگ یا سوٹ کیس اور ایک چھوٹا ہینڈ بیگ، تین چار جوڑے کپڑے، تولیہ صابن، سرف، دو عدد چپل، احرام، بیلٹ، کاغذات کیلئے چھوٹا بیگ، قلم کاغذ، موبائل چارجر، ھینڈ فری، ریزر بلیڈ، قینچی، ناخن تراش اور حسب ضرورت خشک میوہ جات چائے و چینی شامل ہیں۔ مطلوبہ سامان خریدنے اور ااحباب ورشتہ داروں کی ساتھ ملکر دعا اور الوداع لینے میں ہماری روانگی کی تاریخ بھی پہنچ گئی۔

حاجی کیمپ روانگی

ہم نے فلائٹ سے دو دن قبل پشاور جانے کا ارادہ کیا، تا کہ حاجی کیمپ کی تربیتی پروگراموں میں شریک ہو سکیں اور کچھ دوست رشتہ داروں سے بھی مل سکیں۔ اس لئے 31 جولائی بروز بدھ صبح 11 بجے گھر سے نکل گئے۔ ظہرانہ اور نماز ظہر خار میں ماموں کے ہاں ادا کر کے 1:30 پر پشاور روانہ ہوئے۔ گاڑی میں، ہم پانچ بندے تھیں۔ کافی آرام دہ سفر کے بعد تقریباً 4:30 بجے پر پشاور حیات آباد فیز 7 میں واقع حاجی کیمپ پہنچ گئے۔

حکومت نے حج انتظامات اور حجاج کی نقل و حمل کیلئے بڑے شہروں میں حاجی کیمپ بنائے ہیں، جہاں وزارت حج و مذہبی امور کی طرف سے حج ڈائریکٹر اور متعلقہ سٹاف موجود ہوتا ہے۔ یہاں ہر بینک اور ایئر لائنز کے دفاتر بھی ہوتے ہیں۔ موسم حج میں یہاں کافی گہما گہمی ہوتی ہے۔ حجاج کرام کی سہولت کیلئے یہاں ایک بازار بھی لگایا جاتا ہے جس میں حاجیوں کی ضروریات کی تمام چیزیں ملتی ہیں۔

حاجی کیمپ کی اندر صرف حج جانے والے افراد داخل ہو سکتے ہیں۔ گیٹ پر اپنا تعارف کر کے ہم اندر داخل ہوئے۔ سب سے پہلے ہمیں سعودی ایئر لائنز کے دفتر لے جایا گیا۔ جہاں ہم نے اپنا پاسپورٹ، تعارفی کارڈ، لاکٹ وغیرہ وصول کئے۔ وہاں سے متعلقہ بینک برانچ چلے گئے جہاں سے حاجیوں کو واپسی رقم دی جاتی، لیکن ہمیں بتایا گیا کہ آپ لوگ منٰی میں وی آئی پی مکتب نمبر تین میں شامل ہیں اس لئے آپ کو واپس پیسے نہیں ملیں گے۔ وہاں سے ناامید ہو کر لوٹ گئے۔ کاغذی کارروائی کے مختلف مراحل سے گزرنے کے بعد ہمیں اقامت گاہ یعنی کمرہ بتایا گیا جہاں ہم نے سامان رکھ کر آرام کیا۔ نمازیں حاجی کیمپ کی مسجد میں ادا کیں، وہاں ہر نماز کی بعد حج وعمرہ کی بارے میں تربیتی بیانات ہوتے ہیں۔ سارے نمازی بیک وقت بلند آواز سے تلبیہ پڑھتے ہیں جو بہت روح پرور منظر پیش کرتا ہے۔ نماز عشاء اور کھانے کے بعد رات کو اپنی اقامت گاہ میں سو گئے۔

جمعرات یکم اگست 2019

پر سکون رات گزار کر ہم نماز فجر سے قبل اٹھ گئے اور تیاری کر کے مسجد گئے۔ نماز فجر کے بعد بیان سنا اور اشراق پڑھ کر ناشتہ کیا۔ پھر ویکسین لگانے کیلئے متعلقہ کمرہ گئے۔ صبح دس بجے سودا سلف کیلئے خیبر بازار گئے۔ وہاں اپنے ساتھی اور رشتہ دار محمد عامر کے ساتھ ملے۔ خریداری کر کے ان کے ساتھ دکان میں کافی وقت گزار کر نماز عصر کیلئے حاجی کیمپ پہنچ گئے۔ اسی دن کا بقیہ وقت حاجی کیمپ ہی میں گذارا، نمازیں باجماعت ادا کیں اور تربیتی بیانات بھی سنے۔ نماز عشاء کے فوراً بعد سونے کا ارادہ کیا، کیونکہ اگلے دن ہمیں سفر پر روانہ ہونا تھا، جہاں تھکاوٹ اور بے خوابی منتظر تھے۔

جاری ہے۔۔

Salman Rizwan

Punishments/Trials from Allah (سبحانہ وتعالیٰ): those that can be felt and those that should be felt

A student once asked his teacher, "we commit so many sins and repeatedly, still Allah (سبحانہ وتعالیٰ) being Rehmaan and Raheem, does not punish us

The teacher pondered on this statement for a moment and then said pensively, "Yes indeed, He is Rehmaan and Rahim and gives opportunities to His servants to repent and ask for forgiveness.

After a while he said to his student, "but there is another way to look at this. He may not punish us for the sins we commit, in the sense that we don't feel the pain physically, mentally or emotionally, but He does remind us (punish us) in ways which if we pay attention, we can feel the pain.

The student was puzzled by this answer, so he asked the teacher, "how is it so?"

The teacher said,

1. The hardening of your heart and the drying of your tears from the fear of Allah (سبحانہ وتعالیٰ). Is this not telling you that your Lord is not happy with you? Why don't we consider this as punishment?

2. If we feel demotivated to do good deeds, trying to find ways to delay and make excuses. Does it not sound like a punishment from Allah (سبحانہ وتعالیٰ)?

3. Our days, weeks, and sometimes months go by without reciting the Quran. Is this not a punishment from Allah(سبحانہ وتعالیٰ) that we are being kept away from His Book

4. How many times we have heard the recitation of the following ayah, even then we play ignorant?

   لَوْ أَنْزَلْنَا هَٰذَا الْقُرْآنَ عَلَىٰ جَبَلٍ لَرَأَيْتَهُ خَاشِعًا مُتَصَدِّعًا مِنْ خَشْيَةِ اللَّهِ وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ

«If We had sent down this Qur'an upon a mountain, you would have seen it humbled and coming apart from fear of Allah. And these examples We present to the people that perhaps they will give thought (21)» [Al-Hashr: 21]

Does this not have any effect on us? And if not, is this not a punishment?

1) How many long nights have we slept, but never made an attempt to wake up a little earlier than Fajr and perform nawafil of "Qiyaam al layl"? Even waking up for Fajr is heavy on us. Should this not feel like a punishment?

2) How many opportunities of "khair" and "barakah" do we get in our lifetime? We have occasions like Ramadan, Eid, and the ten days of zul hajh. Your life of ignorance and sins does not have time to make amends and put things in the right perspective. How is this not a punishment?

3) In our lifetime we get several opportunities to learn the Quran, understand it and act upon it through the life of our Prophet (saw). We let go of such opportunities as we are too busy in the material pleasures of this temporary life. Does it not show that Allah (سبحانہ وتعالیٰ) is not happy with us?

Why does the punishment have to be physical, financial, emotional, or mental? Why Allah (سبحانہ وتعالیٰ) being unhappy does not feel like a punishment to us? Or is there a bigger punishment than this? Why does a good deed feel so heavy?

Why does mentioning of Allah's name make our tongues stutter?

Why do we give up so easily to our evil thoughts and physical pleasures?

Why is the desire of making more and more so deep rooted in our hearts?

Do we not feel proud and have a sense of real achievement if we have a good life, money, status, power and control?

Should this all be not felt like a punishment?

We forget our own shortcomings, bad habits but always manage to remember to back bite others, finding faults with them and lying about their situations and engaging in gossiping

Forgetting the judgement day and striving hard to be “successful” in this world, is itself a form of punishment

Have we ever pondered over the following ayah?

وَلَوْ أَرَادُوا الْخُرُوجَ لَأَعَدُّوا لَهُ عُدَّةً وَلَٰكِن كَرِهَ اللَّهُ انبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ وَقِيلَ اقْعُدُوا مَعَ الْقَاعِدِينَ

«And if they had intended to go forth, they would have prepared for it [some] preparation. But Allah disliked their being sent, so He kept them back, and they were told, "Remain [behind] with those who remain."(46)» [At-Tauba: 46]

If there is no willingness to prepare for the Hereafter, Allah (سبحانہ وتعالیٰ) also does not help and leaves such people alone. That should ring the bell! Although it may not appear to be a punishment.

Fear Allah (swt). His test/punishment for your money or health or children is actually a very small one

The biggest punishment is to be felt (not experienced physical, mentally, emotionally or financially and only a true Muslim (Mo’min) can feel if something has changed in his heart

Let’s ask for Forgiveness and Mercy from Allah (سبحانہ وتعالیٰ)

سب سے زیادہ حسن سلوک کے لائق

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَجُلٌ: يَا رَسُولَ اللهِ، مَنْ أَحَقُّ النَّاسِ بِحُسْنِ الصُّحْبَةِ؟ قَالَ: أُمُّكَ، ثُمَّ أُمُّكَ، ثُمَّ أُمُّكَ، ثُمَّ أَبُوكَ، ثُمَّ أَدْنَاكَ أَدْنَاكَ. (صحیح المسلم، حدیث 2548)

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! لوگوں میں سے سب سے زیادہ میرے اچھے سلوک کا کون حقدار ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا تیری ماں، پھر تیری ماں، پھر تیری ماں، پھر تیرے باپ کا، پھر جو تیرے قریب ہو، پھر جو تیرے قریب ہو۔

محمد مبشر نذیر

سلسلۂ سوال و جواب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، مبشر بھائی!

امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ میر ایک سوال ہے کہ ہم جنس پرستی(Homosexuality) کسی بھی انسان میں قدرتی طور پر ہوتی ہے، تو اگر اکوئی انسان ہم جنس پرست ہے تو اس میں اس کی کیا غلطی ہے؟ اور اسلام میں اس چیز سے کیوں منع کیا گیا ہے؟ جبکہ یہ کچھ لوگوں میں یہ اللہ ہی کی طرف سے ہوتی ہے؟

جواب:

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

جہاں تک ہوموسیکسوئلٹی یعنی ہم جنس پرستی کا تعلق ہے تو یہ قطعی طور پر فطرت کا حصہ نہیں ہے۔ اگر فطرت کے مطابق ہوتا تو پھر اسے کبھی منع ہی نہ کیا جاتا۔

یہ بالکل اس طرح ہوتا جیسا کہ ہم سبزی، دال اور گوشت کھانا کھاتے ہیں کہ وہ فطرت کا حصہ ہوتا ہے، اس لیے کسی بھی دین میں اسے حرام نہیں کیا گیا ہے۔ ہاں انسان میں یہ غلط فہمی ہو سکتی ہے کہ گوشت کس جانور کا گوشت کھائیں اور کس جانور کا نہیں۔ فطرت میں اللہ تعالی نے یہ بتا دیا کہ آپ اس جانور کا گوشت کھا سکتے ہیں، جو شکار نہیں کرتے ہیں۔ شکاری جانوروں کا کھانا آپ کے لیے فطرت کے طور پر نہیں ہوتا ہے کیونکہ اس کے کیمیکلز سے انسان پر نقصان ہوتا ہے۔ ہاں کچھ جانوروں میں گرے ایریا آجاتا ہے تو اسے اللہ تعالی نے قرآن مجید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے واضح فرما دیا ہے۔

بالکل یہی صورتحال ازدواجی تعلق سے ہے۔ کس کے ساتھ سیکس کا تعلق رکھیں اور کس کا نہیں؟ اسے اللہ تعالی نے شریعت میں تورات اور قرآن میں بتا دیا کہ صرف میاں بیوی میں یہ تعلق ہو، کسی اور کے ساتھ نہ ہو۔ انسانوں میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ہوموسیکسوئل شادی کر لیں یا نہ کریں؟ اس کے لیے فلسفہ ایجاد کیا کہ کر سکتے ہیں۔ اس کے لیے جھوٹا پراپیگنڈا کر کے میڈیا کے ذریعے لوگوں میں آئیڈیاز پھیلا دیے تاکہ وہ اس پر اپیگنڈا کے ذریعے اپنی مارکیٹنگ کر سکیں۔

اس کے لیے فطرت سے آپ خود دیکھ سکتے ہیں کہ اپنے جسم کو بچپن سے لے کر آج تک سوچ لیجیے کہ کیا فطرت میں مردوں سے سیکس ایٹریکشن آتی ہے یا نہیں؟ آپ کا اپنا ذہن ہی بتا دے گا کہ یہ خواہش نہیں آتی ہے بلکہ لڑکیوں کے ساتھ سیکس ایٹریکشن ہی آجاتی ہے۔ اب جن لوگوں میں ہوموسیکسوئل کیسے پیدا ہوتا ہے؟ اس کے لیے آپ چند ہوموسیکسوئل

لوگوں کا انٹرویو کر لیجیے کہ ان کے ہاں یہ خواہش کیسے پیدا ہوئی ہے؟ اس کا جواب آپ کو یہی ملے گا کہ ان کا کلچر، میڈیا اور ان کی تربیت سے ہی یہ خواہش پیدا ہوئی ہے۔

اس سے یہ کنفرم ہوتا ہے کہ یہ خواہش انسانوں کی تربیت سے ہی پیدا ہوتی ہے، ورنہ کسی بچے میں یہ خواہش پیدا نہیں ہوتی ہے۔ کسی بچے کو اس کا بھائی یا چچا یا دوست وغیرہ میں یہ بیماری پیدا ہو گئی ہو تو وہ اس بچے تک پہنچا دیتا ہے۔ اس کے لیے میں نے انٹرویو کر کے یہی دیکھا ہے کہ بچپن میں جو لڑکا ہاسٹل میں رہا، تو اس میں ایسی عادت پیدا ہو جاتی ہے جسے ہم بگاڑ اور بیماری ہی کہہ سکتے ہیں۔ ایسے لوگوں میں دنیا پرست بلکہ مذہبی لوگوں میں بھی یہ بیماری پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح آپ بھی ہوموسیکسوئل لوگوں کا انٹرویو کر کے دیکھ لیجیے کہ ان کے ہاں خواہش کیسے پیدا ہوئی تو آپ کے پاس بھی یہی جواب ملے گا جو میں نے عرض کیا ہے۔

سوال: کیا شادی کے بعد مرد اپنی بیوی کا دودھ پی سکتا ہے؟

جواب:

آپ کا سوال دلچسپ ہے۔ کسی خاتون کی چھاتیوں میں دودھ ایک دم پیدا نہیں ہوتا، بلکہ اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب خاتون کے پاس بچہ پیدا ہو جائے۔ لہذا شوہر کو اپنی بیگم کا دودھ نہیں پینا چاہیے کیونکہ یہ اس کے بیٹے یا بیٹی کا حق ہوتا ہے کہ وہ اپنی ماں کا دودھ پی سکیں۔ یہ بالکل اسی طرح ہے کہ جس طرح ایک شخص کا کوئی حق ہو، اس سے دوسرا کوئی چھیننے کی کوشش کرے، جس طرح ڈاکو یہ کام کرتا ہے۔

آپ کا سوال غالباً اس صورتحال میں ہے کہ جب میاں بیوی ازدواجی تعلق قائم کرتے ہیں تو اس وقت ظاہر ہے کہ شوہر بیوی کے پستان کو اپنے منہ سے ٹچ کر دیتا ہے کہ یہ سیکس کا حصہ ہوتا ہے۔ اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے لیکن جب بیوی اپنے بچے کی بریسٹ فیڈ کر رہی ہو تو اس وقت شوہر کو چاہیے کہ اس کے پستان کو اس طرح منہ سے ٹچ نہ کرے کہ اس سے دودھ نکل آئے، بلکہ اسی طریقے سے کریں کہ دودھ نہ نکلے۔ کبھی غلطی ہوئی اور ایک آدھ قطرہ دودھ کا نکل بھی آیا تو اس سے ظاہر ہے کہ بیوی، اپنے شوہر کی ماں نہیں بن جائے گی کیونکہ دودھ شریک ماں تو اسی وقت بنتی ہے، جب وہ بچے کو دودھ پلا رہی ہوتی ہے۔

بس اصول یہی ہے کہ میاں بیوی ازدواجی تعلق تو قائم کریں لیکن اس کے طریقے میں اتنا احتیاط کر لیں کہ اپنے بچے اور بیگم کو کوئی نقصان نہ ہو۔

والسلام

محمد مبشر نذیر

تعلیمی و تربیتی کورسز کے ویب لنکس

علوم القرآن کا دور جدید اردو زبان میں مطالعہ۔۔۔ترجمہ اور تفسیر

http://mubashirnazir.org/Lectures/Quranic%20Studies%20Lectures.htm

تعمیر شخصیت کا طریقہ کار

http://mubashirnazir.org/Lectures/Personality%20Development%20-%20Video%20and%20Audio%20Lectures.htm

علم الفقہ

http://mubashirnazir.org/Lectures/Fiqh%20-%20Islamic%20Jurisprudence%20Lectures.htm

علوم القرآن لیکچرز

http://mubashirnazir.org/Lectures/Video%20and%20Audio%20Lectures.htm

مسلمہ امت کی علمی، فکری، دعوتی اور سیاسی تاریخ

http://mubashirnazir.org/Lectures/History%20-%20Video%20and%20Audio%20Lectures.htm

علوم الحدیث

http://mubashirnazir.org/Lectures/Hadith%20-%20Prophet's%20Knowledge%20&%20Practice%20Lectures.htm

Quranic Arabic Program

http://mubashirnazir.org/Lectures/Quranic%20Arabic%20Language%20Lectures.htm

قرآن اور بائبل کے دیس میں

http://mubashirnazir.org/Lectures/Tourism%20in%20Quran%20&%20Bible.htm